قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا چوہترواں سال

ماہنامہ طلوعِ اسلام

ستمبر 2017ء

لاہور

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پرویز صاحب کے علمی اسلوب تحقیق کی تائید

قرآنی نظریات کی روشنی میں مغرب کے غلط تصورات کی تردید میں محترم پرویز اور ہمارے ہاں کے مفکرین نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سے ڈاکٹر علامہ اقبال، ڈاکٹر رفیع الدین احمد اور ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کی تصنیفات سے چند اقتباسات پیش کئے جا رہے ہیں۔ جب بھی قارئین ان اقتباسات کی روشنی میں محترم پرویز صاحب کی تصنیفات کا جائزہ لیں گے تو وہ ان تمام خوبیوں کو بشمول دیگر خوبیوں کے ان میں پائیں گے۔ اس موضوع پر محترم پرویز صاحب کا موقف جاننے کے لئے خصوصی طور پر ان کی تصانیف ''انسان نے کیا سوچا'' اور ''اسلام کیا ہے'' ملاحظہ فرمائی جاسکتی ہیں۔

(1) ڈاکٹر علامہ اقبالؒ کا موقف:

1- عقل اور وحی میں تصادم نہیں بلکہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔

2- قرآن سے راہنمائی حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ:

(الف) اپنے زمانوں کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہوں۔

(ب) قرآن کریم کو عربی زبان اور تصریفِ آیات کی رو سے سمجھنا چاہئے اور اس پر خارجی عناصر کو اثرانداز نہیں ہونے دینا چاہئے۔

(2) ڈاکٹر محمد رفیع الدین کا موقف:

مغرب کے غلط فلسفیانہ تصورات کی تردید قرآنی نظریات سے کرتے ہوئے مصنف کے لئے ضروری ہے کہ:

1- وہ روحِ قرآن کے ساتھ پوری پوری واقفیت پیدا کریں جس کے بغیر قرآنی اور غیر قرآنی تصورات میں تمیز کرنا مشکل ہوگا۔

2- وہ مغرب کے غلط تصورات کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال وعمل سے پوری پوری واقفیت پیدا کریں۔

3- وہ علم کے تمام شعبوں سے یعنی مادی، حیاتیاتی اور نفسیاتی علوم اور فلسفہ سے جو ان علوم کو جمع کر کے ایک مکمل نظریہ کائنات ترتیب دیتا ہے، اس حد تک واقف ہوں کہ ان کی ساری وسعت میں جہاں کہیں کوئی اسلامی تصور موجود ہو اسے پہچان کر لے سکیں اور استخراج اور استنباط سے مزید صحیح اسلامی تصورات کو اخذ کر سکیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 66 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ستمبر 2017ء

جلد 70 | شمارہ نمبر 09

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: ان کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجئے	ادارہ	4
کیا ''پرویزیت'' کوئی فرقہ ہے؟	ملک منظور حسین لیل، بھکر	6
آزادی کا قرآنی مفہوم	غلام احمد پرویز	14
بچوں کا صفحہ: السلام علیکم	ادارہ	29
نوجوانوں کا صفحہ: نخلِ سینا (نشست نمبر 1)	محمد علی صابر صدیقی	31
قرآن جدید تحقیقات کی روشنی میں	پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق	36
نیست ایں کار فقیہاں اے پسر	خواجہ ازہر عباس، کراچی	39
دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان (قسط نمبر 7)	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	50

ENGLISH SECTION

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل)** **(Episode-3)**

Chapter 7: Present Hell (*Qiyamat-e- Maujood* قیامت موجود) –

To Quran lovers (Tulu-e-Islam Convention, April, 1963)

By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam) **59**

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل)** **(Episode-1)**

Chapter 6: Tears of passion (*Shola-e-Namnaak* شعلہ نمناک) –

To my fellow travelers (Tulu-e-Islam Convention, April, 1962)

By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam) **60**

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون:
پاکستان: 50 روپے فی پرچہ
550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions
Bank A/C No: 4073177672

For International Transactions
IBAN: Pk21 NBPA 0465 0022 0003 0827
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

ادارہ طلوعِ اسلام
B-25 گلبرگ 2، لاہور
54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546 , Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com
www.facebook.com/Talueislam

طلوعِ اسلام

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ وبر پیدا
ربود آں ترکِ شیرازی دل تبریز وکابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز وسازِ زندگی کہ دے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

ان کارناموں کو افسانے نہ بننے دیجئے

ہماری فوج ارتقائی منازل رحیمیت کے انداز سے طے کر رہی تھی ___ نہایت خاموش، غیر مرئی اور غیر محسوس طریقہ سے مسلسل اور متواتر اپنے کام میں مصروف، پیہم اور لگاتار، انتہائی ثبات واستقامت سے، اپنی قوت میں اضافہ کرنے میں مشغول ___ کہ 6 ستمبر 1965ء کی صبح، ہندو نے اُس آگ کو یک لخت اُگل دیا جسے اُس کا حسد وانتقام سے بھنچا ہوا سینہ، اٹھارہ برس سے، اپنے اندر دبائے چلا آ رہا تھا ___ اچانک اور بلا اعلانِ جنگ کئے حملہ ___ اور اس کے جواب میں، ہماری افواج قاہرہ، بادل کی گرج اور بجلی کی چمک کے ساتھ یوں لپک کر اُبھریں، جیسے شیر کچھار سے نکلے اور ایک ہی جست میں گیدڑ کو جا دبوچے۔ ہماری افواج کے اس محیر العقول، برق پا جوششِ کردار کو دیکھ کر دنیا بھر کے ماہرینِ فنِ حرب، آج تک انگشت بدنداں ہیں کہ انہوں نے یہ کچھ کیسے کر دکھایا۔ لیکن ہمیں اس ''کیسے'' کے جواب کی تلاش میں کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں۔ ہماری افواج، اس تمام دوران، بیکار بیٹھیں مفت کی نہیں کھا رہی تھیں، وہ خدا کی صفتِ رحیمیت کو سامنے رکھتے ہوئے، نہایت خاموشی سے ''جہاد کی تیار میں مصروف (1)'' تھیں۔ وہ اپنی مضمر صلاحیتوں کو اپنے اندر مرتکز کرتی چلی آ رہی تھیں۔ وہ قوتیں تاریخ کے اس نازک ترین لمحہ میں، خدا کی صفتِ رحمانیت کے تتبع میں، یوں یک لخت نمودار ہو گئیں جس طرح بربط کے خاموش تاروں میں چھپے ہوئے نغمے، ایک جنبشِ مضراب سے فضا میں ارتعاش پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ ؎

جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا ۔۔۔ تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

اُس زمانے میں یہ خیال (ناواقف لوگوں کی زبان پر) عام تھا کہ ہماری فوج ہندوستان کے ان عزائم سے بے خبر تھی اور اسی لئے ان کی طرف سے جو حملہ اچانک ہوا تو اس کی مدافعت کی تدابیر قبل از وقت نہیں کی جا سکی تھیں۔ یہ خیال غلط تھا۔ اُسی زمانے میں ایک واقفِ حال نے بتایا تھا کہ پاکستانی افواج کی عقاب نگہی کا یہ عالم تھا کہ ہندوستان نے پانچ مختلف گوشوں سے حملہ کیا تھا اور ان میں سے چار مقامات پر ہمارے حفاظتی انتظامات پہلے سے موجود تھے۔ صرف ایک مقام خالی تھا۔ لیکن چونکہ ہماری افواج باقی ہر چہار محاذوں کی طرف سے مطمئن تھیں اس لئے اس پانچویں محاذ کی مدافعت میں زیادہ مشکل نہیں اٹھانی پڑی۔ اس ایک واقعہ سے آپ اندازہ لگائیے کہ جس زمانے میں یہ کہا جا رہا تھا کہ ہماری افواج بیکار بیٹھی مفت کی کھا رہی

---

(1) نبی اکرم ﷺ سے کسی نے پوچھا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب جہاد (قتال) ہو رہا ہو تو اس میں شریک ہو اور جب نہ ہو رہا ہو تو اس کی تیاری میں مصروف ہو۔

ملک منظور حسین لیل۔ بھکر
0332-7636560
mhleeladv@yahoo.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پرویز صاحب اور اُن کے نظریات کا تعارف

(کچھ وضاحتیں)

کیا ''پرویزیت'' کوئی فرقہ ہے؟

فرقہ بندی کی نفسیات:

طلوعِ اسلام اکتوبر، 1979ء، ص:14، (امت کے اندر، الگ گروہ، فرقہ یا جماعت قائم کرنا، دراصل فرقہ بندی ہی ہے کیونکہ جماعت اور فرقہ کی۔NATURE۔ایک ہی ہے۔مئولف) ''جب کوئی شخص ایک نئی جماعت کی تشکیل کا ارادہ کرتا ہے تو اسے پہلے سے موجود فرقوں اور جماعتوں کو (Condemn) کرنا پڑتا ہے۔یعنی یہ کہنا پڑتا ہے کہ ان جماعتوں میں سے کوئی بھی اس فریضہء خداوندی کو ادا نہیں کر رہی اس لئے ایک نئی جماعت کی تشکیل ناگزیر ہے۔مثال کے طور پر جماعت اسلامی ہی کو لیجئے جو اس دعوے کی سب سے بڑی مدعی ہے۔مودودی صاحب کسی جماعت کے بغیر اپنے خیالات کی اشاعت کرتے چلے آرہے تھے۔اور جماعت سازی کو تفرقہ پردازی قرار دیتے تھے۔۔چنانچہ انہوں نے لکھا تھا کہ: ''مسلمان قوم تو پہلے ہی سے ایک جمعیت ہے۔اس جمعیت کے اندر کوئی الگ جمعیت الگ نام سے بنانا اور مسلمان اور مسلمان کے درمیان کسی وردی یا کسی ظاہری علامت یا کسی خاص نام یا کسی خاص مسلک سے فرق و امتیاز پیدا کرنا اور مسلمانوں کو مختلف پارٹیوں میں تقسیم کر کے ان کے اندر جماعتوں اور فرقوں کی عصبیتیں پیدا کرنا یہ دراصل مسلمانوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ ان کو اور کمزور کرنا ہے۔یہ تنظیم نہیں، تفرقہ پردازی اور گروہ بندی ہے۔'' (مسلمان اور سیاسی کشمکش، جلد اوّل، ص:57)

اس کے بعد جب ان کے دل میں اپنی الگ جماعت کے قیام کا خیال ابھرا تو یہ ''تفرقہ پردازی اور گروہ بندی'' نہ رہی بلکہ عین تقاضائے اسلام قرار پا گئی۔اس کے لئے، جیسا کہ میں نے اوپر کہا ہے، یہ ضروری تھا کہ پہلے باقی جماعتوں کو (Condemn) کیا جائے۔چنانچہ انہوں نے اس سلسلے میں لکھا: ''اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی جو مختلف جماعتیں اسلام کے نام سے کام کر رہی ہیں اگر فی الواقعہ اسلام کے معیار پر ان کے نظریات، مقاصد اور کارناموں کو پرکھا جائے تو سب کی سب جنس کاسد نکلیں گی۔۔خواہ مغربی تعلیم و تربیت پائے ہوئے سیاسی لیڈر ہوں یا علمائے دین اور مفتیانِ شرعِ متین۔۔۔دونوں قسم کے راہنما اپنے نظریہ اور اپنی پالیسی کے لحاظ سے یکساں گم کردہ راہ ہیں۔۔۔دونوں راہِ حق سے

ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں۔۔انسانیت کو اس دردناک انجام سے اگر کوئی چیز بچا سکتی ہے تو وہ صرف ایک صالح نظریہ اور صالح جماعت کا برسرکار آنا ہے۔۔اس کے لئے صرف اتنی بات کافی نہیں کہ یہاں صحیح نظریہ موجود ہے۔صحیح نظریہ کے ساتھ ایک صالح جماعت کی بھی ضرورت ہے۔'' (سیاسی کشمکش، حصہ سوم، ص: 201، 167، 95)۔اس طرح انہوں نے اپنی جماعت کی تشکیل کی اور اس کے جواز میں سند اسی آیت (3:103) کی پیش کر دی۔اس سے یہ نہیں ہوا کہ پہلے سے موجود فرقوں اور جماعتوں نے کہہ دیا ہو کہ ہم سب واقعی راہ گم کردہ ہیں اس لئے ہم اپنے وجود کو ختم کرتے ہیں۔اس فریضہء خداوندی (امر بالمعروف ونہی عن المنکر) کی ادائیگی کے لئے یہی نئی جماعت موجود رہے گی۔مودودی صاحب نے انہیں راہ گم کردہ قرار دیا تھا انہوں نے اپنے آپ کو برسرحق اور جماعت اسلامی کو راہ گم کردہ قرار دے دیا۔۔اور اس طرح یہ سب اپنی اپنی جگہ قائم اور مطمئن رہے کہ ہم حق پر ہیں، اور باقی سب باطل پر۔یہی وہ فرقہ بازی اور جماعت سازی ہے جسے قرآن شرک کہہ کر پکارتا ہے۔

یہ شرک:

جب کہتا ہے کہ: وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٣١﴾ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ۖ كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ ﴿٣٢﴾ (30:32-31)۔۔''مسلمانو دیکھنا! تم ایمان لانے کے بعد مشرکین میں سے نہ ہو جانا یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں تفرقہ پیدا کر دیا اور خود بھی ایک فرقہ یا جماعت (گروہ) بن گئے۔اس تفرقہ بازی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر گروہ اس خیال میں مگن رہتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور باقی سب باطل پر۔'' جب تک کوئی فرقہ یا جماعت (حزب) یہ ذہنیت پیدا نہ کرے، اس کا جداگانہ تشخص باقی نہیں رہ سکتا۔الگ تشخص کے لئے دو شرائط لازمی ہیں۔۔۔جماعت کے اندر عصبیت اور دوسروں کے خلاف نفرت، اور یہ دونوں چیزیں اس وقت پیدا ہوتی ہیں جب آپ اپنے کو برسرحق اور دوسروں کو باطل پرست قرار دیں۔ہر فرقہ اور ہر جماعت کی یہی کیفیت ہوتی ہے۔۔۔عقیدتاً تو ان کی یہی کیفیت ہوتی ہے لیکن بعض اوقات ذاتی مصلحتیں انہیں بعض دوسری جماعتوں کے برسرِحق ہونے کے اعتراف پر مجبور کر دیتی ہیں۔مثلاً ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ جب مودودی صاحب نے اپنی جماعت کی طرح ڈالی تو یہ کہہ کر کہ:۔۔ملک کے تمام علمائے دین اور مفتیانِ شرعِ متین سب کے سب راہِ حق سے ہٹ کر تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور تمام فرقے اور جماعتیں جنس کاسد ہیں۔لیکن جب یہاں انہوں نے ان ہی علمائے دین اور مفتیانِ شرعِ متین کے اتحاد سے متحدہ محاذ قائم کیا تو فرمایا: ''موجودہ حالت میں ایسی جماعتوں کی ضرورت ہے جو مسلمانوں میں دین کا علم پھیلانے کی کوشش کریں اور ان کی اخلاقی حالت کی اصلاح کے لئے جدوجہد کریں۔۔۔یہ وہ تفرقہ نہیں جس کی مذمت قرآن میں کی گئی ہے بلکہ یہ اس آیتِ قرآنی کے منشاء کے عین مطابق ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ہونا چاہیئے جو نیکی کی طرف بلائے اور برائیوں سے روکے۔'' (نوائے وقت، بابت 24 اکتوبر 1978ء)۔چلتے چلتے یہ بھی دیکھئے کہ مودودی صاحب نے قرآنی

آیت کا ترجمہ تو یہ کیا ہے کہ ''تم میں سے ایک گروہ تو ایسا ہونا چاہیئے'' لیکن کہا یہ ہے کہ ''موجودہ حالت میں ایسی جماعتوں کی ضرورت ہے۔'' آپ نے غور فرمایا کہ جب انسان پر مفاد پرستی کے جذبات غالب آجاتے ہیں تو وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتا کہ وہ کس قسم کی متضاد باتیں کرتا ہے۔''

فرقوں کا وجود:

طلوعِ اسلام مارچ 1978ء، ص: 67: ''قرآن کی ''نصوصِ صریحہ کی موجودگی میں، فرقوں کی گرہوں کو آئینی طور پر مضبوط کرانے کی کوشش کرنا، آپ خود ہی سوچ لیجئے کہ کیا کہلائے گی۔ ہمیں تسلیم ہے کہ آج ہم میں فرقے موجود ہیں۔ اسے بھی ہم اچھی طرح جانتے ہیں کہ فرقے شباشب نہیں مٹ سکتے۔ اس لئے ان کے وجود کو سرِ دست، اضطراری طور پر گوارا کرنا ہی پڑے گا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ہماری کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ ہم جس قدر جلد ممکن ہو، اس ''مشرکانہ حالت'' سے نکل کر، موحدانہ منزل میں پہنچ جائیں۔ اس کے لئے پہلا قدم یہ ہے کہ مملکت، قرآن کریم کی بنیادوں پر ایسا ضابطہء قوانین مرتب کرے کہ جس کا اطلاق تمام امت پر یکساں طور پر ہو۔ اس سے خود بخود اختلافات ختم ہو جائیں گے۔۔ فرقوں کے وجود کو، بامرِ مجبوری علیٰ حالہٖ رہنے دینے سے مطلب یہ ہے کہ جس جس طریق سے کوئی فرقہ اپنے ہاں نماز وغیرہ ادا کرتا ہے، اس میں سرِ دست دخل نہ دیا جائے۔ یاد رہے کہ اسلام میں عبادات اور معاملات میں کوئی فرق نہیں۔ ''عبادت'' کے معنی احکام خداوندی کی اطاعت ہیں۔ لیکن چونکہ ہمارے ہاں مختلف فرقوں نے ''عبادت'' (بمعنی پرستش) کے طور طریقوں کو اپنا امتیازی نشان قرار دے رکھا ہے اس لئے جب تک فرقوں کا وجود برداشت کیا جائے گا، اس وقت تک ان کی ''عبادت'' کے طور طریق سے بھی تعرض نہیں کیا جائے گا۔ تا آنکہ کچھ وقت کے بعد، صحیح تعلیم و تربیت سے، ہماری آنے والی نسلیں خود محسوس کر لیں کہ دین میں اس تفرقہ کی قطعاً اجازت نہیں۔ اُس وقت نماز کا بھی ایک ہی طریقہ ہوگا۔ اور جس طرح قرنِ اول میں ہوتا تھا امام، خود حکومت کے ارکان ہوں گے۔۔۔ طلوعِ اسلام کی یہ دعوت بھی کچھ نئی نہیں۔ وہ پہلے دن سے یہ اعلان کرتا چلا آرہا ہے کہ:۔ امت کے مختلف فرقے، نماز، روزہ وغیرہ میں جس جس طریق پر عمل پیرا چلے آرہے ہیں، اس میں ردوبدل کرنے کا حق کسی فرد یا کسی گروہ کو حاصل نہیں۔۔۔ خود طلوعِ اسلام نے نماز کا کوئی نیا طریقہ وضع نہیں کیا۔ فرقہ اہلِ قرآن نے ایسا کیا ہے اور یہ اس کی سخت مخالفت کرتا چلا آرہا ہے۔ نہ ہی اس نے کوئی نئی فقہ ایجاد کی ہے۔ اس نے مملکت کے آئین و قوانین کے بارے میں جو کہا ہے کہ اس کی بنیاد قرآن کریم کے غیر متبدل اصولوں پر ہونی چاہیئے تو اس لئے کہ پاکستان کا اسلامی مملکت بننا اس کے ایمان کا تقاضا ہے، اور اس کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں۔''

حق پر ہونے کا دعویٰ:

طلوعِ اسلام دسمبر 1970ء، لمعات: ''جب ان حضرات کے سامنے قرآن مجید کی وہ آیات پیش کی جاتی ہیں جن میں فرقہ بندی کو عذاب، شرک، کفر اور ارتداد (3:104، 32-30:31، 3:105، 25-47:24) قرار دیا گیا ہے تو ان میں

سے ہر فرقہ کا جواب یہ ہوتا ہے کہ: ''صاحب! ہم نے فرقہ نہیں بنایا۔ ہم تو اُسی اسلام پر قائم چلے آ رہے ہیں جو نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں رائج تھا۔ ان دوسرے فرقوں نے اپنا اپنا اسلام الگ تجویز کر لیا اور ہم سے علیحدہ ہو گئے۔ آپ ان سے کہئے کہ یہ اپنا جداگانہ مسلک چھوڑ کر اصل اسلام کی طرف آ جائیں۔۔ یعنی ہمارا مسلک اختیار کر لیں۔'' ہر فرقہ کا جواب یہی ہوگا: کل حزب بما لدیھم فرحون۔ کی عملی تفسیر یہی ہے۔ اور ہزار سال کے بین الفرق مناظروں اور مباحثوں کا مقصد یہی تھا کہ ہر فرقہ یہ ثابت کر دے کہ اصل اسلام کے علمبردار وہی ہیں۔ نہ یہ ثابت ہوا، نہ ثابت ہو سکے گا۔ اس لئے کہ جب قرآن نے کہا تھا کہ فرقہ واری میں کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ یہ سمجھتا ہے کہ ہم حق پر ہیں اور دوسرے باطل پر۔ تو اس نے کسی ایک فرقہ کی بھی استثناء نہیں کی تھی۔ وہ (قرآن) اس سوال ہی کو درخورِ اعتناء نہیں سمجھتا کہ فرقوں میں سے کون حق پر ہے اور کون باطل پر۔ وہ امت میں فرقوں کے وجود ہی کو شرک قرار دیتا ہے۔ فرقہ سازی کے سلسلہ میں یہ نہیں ہوا تھا کہ امت ایک مسلک پر چلی آ رہی تھی۔ اس کے بعد ایسا ہوا کہ لوگ اس انبوہ میں سے نکل نکل کر الگ ہو گئے اور اس طرح مختلف فرقوں کا وجود عمل میں آ گیا اور اب ہر فرقہ کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ گروہ جو صحیح اسلام کے راستے پر گامزن تھا، ہم ہیں۔ اور دوسرے لوگ ہم میں سے نکل کر الگ ہو گئے تھے۔ ہوا در اصل یہ تھا کہ جب امت میں مرکزی اتھارٹی (خلافت علیٰ منہاجِ نبوت) باقی نہ رہی تو ان کی (مسلمانوں کی) جمعیت پارہ پارہ ہو گئی۔ اسی منتشر شدہ امت کا نام مختلف فرقے ہیں۔ قرآن نے امت میں تشتت و انتشار کو شرک اور کفر قرار دیا ہے۔ اس میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ فلاں فرقہ صحیح راستے پر چلا آ رہا تھا۔ اور دوسرے فرقے اس میں سے نکل کر الگ الگ ہو گئے۔ لہٰذا، فرقہ بندی کے جرم کے مرتکب وہ فرقے ہیں، یہ نہیں۔ جب زلزلہ سے کوئی چٹان ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتی ہے تو ان میں سے کوئی ٹکڑہ بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں تو اصلی چٹان ہوں۔ اس میں سے الگ ہونے والے ٹکڑے، دوسرے ہیں۔ ٹکڑے ہو جانے سے چٹان کا وجود باقی نہیں رہتا۔ اس لئے کوئی ٹکڑہ بھی یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ وہ چٹان ہے۔ امت میں انتشار پیدا ہو جائے تو اسلام باقی نہیں رہتا۔ اسلئے کسی فرقے کا یہ دعویٰ قابلِ پذیرائی نہیں ہو سکتا کہ وہ حقیقی اسلام کا پیرو ہے اور باقی فرقے باطل پر ہیں۔ منتشر شدہ چٹان کو پھر سے وجود میں لانے کا طریق یہ نہیں کہ مختلف ٹکڑوں سے کہا جائے کہ وہ کسی ایک ٹکڑے میں جا کر جذب ہو جائیں۔ اس کا طریق یہ ہے کہ سب ٹکڑے یکجا ہو کر پھر سے چٹان بن جائیں۔ اسی طرح مختلف فرقوں سے یہ کہنا کہ وہ کسی ایک فرقہ کی فقہ کو اسلامی تسلیم کر کے، تفرقہ کو ختم کر دیں، ناممکن العمل مطالبہ ہے۔ ان میں پھر سے وحدت پیدا کرنے کا طریق یہ ہے کہ تمام فرقے اپنی اپنی روایات اور فقہ کو الگ کر کے، قرآن خالص کو قانون کی اساس قرار دے لیں۔ اور اس اساس پر ایسا ضابطہ قوانین مرتب کر لیں جو عصر حاضر کے تقاضوں کو پورا کر سکنے کے قابل ہو۔ اس کے سوا اسلامی نظام کے قیام کی کوئی صورت نہیں۔'' اس کے بعد طلوعِ اسلام نے فرقہ اہل قرآن کی اس غلطی کا ذکر کیا ہے کہ اس فرقہ نے قرآن کو تو بنیادی اہمیت دی مگر اس کے ساتھ مرکزی اتھارٹی کے تصور کو نظر انداز کر دیا اور خود ہی قرآن سے فقہی احکام مستنبط کر کے ایک نئے فرقے کی بنیاد رکھ دی۔ پھر لکھتے ہیں۔ ''طلوعِ اسلام کے پیشِ نظر وحدتِ امت

کی دونوں کڑیاں ہیں۔۔قرآن بطور اساسِ قانون، اور مرکزی اتھارٹی بطور حکم۔۔یہی وجہ ہے کہ یہ کسی فرد یا گروہ کو اس کا حق نہیں دیتا کہ وہ نئے نئے فقہی احکام مرتب کر کے امت میں مزید انتشار کا موجب بنے۔۔وہ تین نمازوں، نو دن کے روزوں یا اردو میں نماز وغیرہ قسم کی تشتت آفریں تحریکوں کا سخت مخالف ہے۔اس کا مسلک یہ ہے کہ اس وقت مختلف فرقے جس جس مسلک کے پابند ہیں، ان میں کسی قسم کی تبدیلی نہ کی جائے۔اور ایک مرکزی اتھارٹی (اسلامی مملکت) قائم کر کے، قرآن کی اساس پر جدید فقہ مرتب کی جائے جس کی پابندی ہر ایک پر لازم ہو۔'' (لمعات۔دسمبر ۱۹۷۰ء)۔

فرقہ سازی کا جذبہ محرکہ:

طلوعِ اسلام مارچ 1982ء، ص:13: ''ہر رسول کا پیغام یہ تھا کہ ''دین'' قائم کرو اور باہمی تفرقہ مت پیدا کرو۔ہر رسول اس پیغام کے ذریعے ایک جماعت۔ایک امت تشکیل کر کے جاتا۔اس کی امت کچھ وقت تک تو متحد رہتی لیکن اس کے بعد اس میں گروہ بندیاں اور فرقہ سازیاں شروع ہو جاتیں۔یہ کیوں ہوتا؟۔قرآن اس کی وجہ بتاتا ہے کہ:۔وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۔۔۔(42:14) اور (45:17)۔یعنی خدا کی طرف سے ''العلم'' (وحی) آجانے کے بعد، جس کا مقصد تمام اختلافات کو مٹا دینا ہے، باہمی تفرقہ کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔لیکن اس وحی کے وارث، باہمی ضد اور ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے اور ایک دوسرے پر چڑھ دوڑنے کے جذبہ کی وجہ سے مختلف فرقے بنا لیتے ہیں۔

لیڈری کا شوق:

یعنی اس گروہ بندی اور فرقہ سازی کی وجہ یہ نہیں تھی کہ انہیں دین کی کسی حقیقت کے سمجھنے میں غلطی لگ جاتی تھی۔۔کوئی شق مشتبہ اور مبہم رہ جاتی تھی۔خدا کی طرف سے دیئے ہوئے علم میں اشتباہ و ابہام کا کیا کام؟۔یہ فرقہ سازی محض ہوسِ اقتدار کی تسکین کے لئے ہوتی تھی۔ان میں سے جن لوگوں کے دل میں لیڈر بننے کا شوق چراتا وہ اپنا الگ فرقہ بنا لیتے۔پھر ہر فرقہ، دوسرے فرقہ سے آگے نکل جانا اور اس پر غالب آجانا چاہتا۔اس سے باہمی کشمکش اور سر پھٹول شروع ہو جاتی۔اور یوں اس امتِ واحدہ کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے۔اور اس کے ساتھ ہی دین بھی تشتت و افتراق کے پردوں میں گم ہو جاتا۔۔۔اس سے یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے آگئی کہ فرقہ بندی علم و بصیرت اور دلائل و برہان کی بناء پر وجود میں نہیں آتی۔اس کی بنیاد جذبات پر ہوتی ہے۔یہ الگ بات ہے کہ ہر فرقہ کے لوگ اپنے فرقہ کے برسرِ حق ہونے کے ثبوت میں دلائل پیش کرتے دکھائی دیتے ہیں۔اور وہ کون سا جذباتی فیصلہ ہے جس کی تائید میں عقل فسوں ساز دلائل مہیا نہیں کر دیتی۔''

حق کی نہیں، اپنے گروہ کی طرفداری:۔انسان جب کسی گروہ، جماعت یا فرقہ کا رُکن بن جاتا ہے تو پھر وہ حق کی حمایت کرنے کی بجائے اپنے گروہی مفادات کو اوّلیت دیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کو اسلام لانے کے بعد مسلمانوں کے اندر ہر قسم کی الگ گروہ بندی، جماعت بندی یا فرقہ بندی کو سختی سے منع کر دیا اور ایسی کسی قسم کی حرکت کو شرک اور کفر قرار دیا۔(گروہ، فرقہ یا جماعت کا) یہ بُت اپنی قربان گاہ پر (حق اور میرٹ کی) قربانی مانگتا ہے۔مثلاً موجودہ جمہوری

سیاست میں جب کوئی پارٹی برسر اقتدار آجاتی ہے تو اس سے یہ توقع رکھنا عبث ہے کہ وہ دیگر جماعتوں سے حق (میرٹ) کے مطابق برابر کا سلوک کرے گی یا حق کے مطابق ان کے بارے میں رویہ اپنائے گی، قطعاً نہیں۔ جماعت تو بنائی ہی دیگر جماعتوں کو CONDEMN کر کے بر بنائے نفرت و اختلاف جاتی ہے۔۔علاوہ ازیں، اس جماعت کے کارکن، اس جماعت کے لئے کام کر کے اور قربانیاں دے کر اپنا حق مانگتے ہیں۔ اور پارٹی اپنے قربانیاں دینے والے کارکنوں کو یہ حق دینے پر مجبور ہوتی ہے۔ جس سے دیگر حقداروں کا حق مارا جاتا ہے۔ جمہوریت میں اکثریت کی رائے کو بنیادی اصول کی حیثیت حاصل ہے۔ یعنی جو کچھ اکثریت منظور کر لے وہی ''حق'' ہے خواہ، اُس میں انسانیت کی تذلیل ہی کیوں نہ ہو۔ نیز، جمہوریت میں '' کچھ لو اور کچھ دو'' یعنی ''مفاہمت'' کا اصول بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ جبکہ ''حق'' کے معاملے میں یہ اصول غلط قرار پاجاتا ہے۔ ''حق'' مفاہمت نہیں کرتا۔ پارٹیاں ہر وقت جوڑ توڑ اور ایک دوسرے کی ٹانگیں کھینچنے میں لگی رہتی ہیں جس سے قوم کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ نیز اگر آپ فرقہ یا جماعت بندی کریں گے تو پھر دوسروں کو بھی گروہ بندی یا جماعت بندی کا حق دینا پڑے گا۔ یعنی خود بھی شرک اور کفر کے مرتکب ہوں گے اور دوسروں کو بھی اس سے منع نہیں کر سکیں گے۔۔۔ اس سے بچنے کے لئے بے حد احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس شرک اور کفر سے احتیاط کا تقاضا ہے کہ مسلمانوں سے الگ کوئی گروہ، جماعت (پارٹی) یا فرقہ نہ بنایا جائے اور کسی الگ مسجد کا قیام اور کسی قسم کی الگ نماز کا اہتمام نہ کیا جائے۔ موءلف)۔

مسجدِ ضرار:

طلوعِ اسلام مارچ 1982ء، صفحہ نمبر 16:۔ ''قرآن نے صلواۃ کو اُمتِ واحدہ کے لئے وجہء جامعیت قرار دیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں بعض تفرقہ انگیزوں نے ایک نئی مسجد تعمیر کی تو قرآن نے جس شدت سے اس کی مخالفت کی اس کا اندازہ سورہء توبہ کی متعلقہ آیات سے لگ سکتا ہے۔ سنیئے!۔ اور غور سے سنیئے کہ قرآن اس باب میں کیا کہتا ہے۔: وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مَسْجِدًا ضِرَارًا ۔۔۔(9:107)۔ ''جن لوگوں نے اس غرض سے مسجد تعمیر کرائی کہ اس سے ملّتِ اسلامیہ اور خود دین کو نقصان پہنچایا جائے۔'': وَّكُفْرًا ۔ ''اور کفر کی حمایت کی جائے یا کفر کی روش اختیار کی جائے۔'' وَّتَفْرِيْقًۢا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۔۔۔ ''یعنی اس غرض سے کہ مسلمانوں میں تفرقہ پیدا کیا جائے۔ تم اس مسجد کو مسجد سمجھتے ہو؟۔ یہ مسجد نہیں: وَاِرْصَادًا لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ۔۔۔ ''یہ وہ کمین گاہ ہے جس میں بیٹھ کر وہ شخص جو اس سے پہلے خدا اور رسول (نظامِ خداوندی) کا دشمن تھا۔ ملّت پر تیر اندازی کرے گا۔'' یعنی یہ مسجد نہیں، یہ وہ قلعہ ہے جس کے اندر خدا اور رسول کے دشمن پناہ لے کر دین کے قصرِ مشید کو منہدم کرنے کی مذموم کوشش کریں گے۔۔: وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ اِلَّا الْحُسْنٰى ۔۔۔ ''یہ قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ اس مسجد کی تعمیر سے ہمارا ارادہ بجز بھلائی کے اور کچھ نہیں۔ ہم دین کی تخریب تھوڑا چاہتے ہیں۔'' وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۔۔

''تم ان کی باتوں میں نہ آجانا۔ خدا گواہ ہے کہ یہ یکسر جھوٹے ہیں۔'': لَا تَقُمْ فِيْهِ اَبَدًا ۔۔۔ ''اے رسول! تم اس

مسجد میں ایک قدم بھی نہ رکھنا۔'' یہ مسجد یونہی سمجھئے کہ دوزخ کے کنارے پر کھڑی ہے۔ جس نے اسے بنایا ہے اور جو اس میں داخل ہوگا۔ یہ ان سب کو لے کر جہنم کے عمیق گڑھے میں جا گرے گی۔ (109-9:107)۔ چنانچہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے صحابہؓ کو بھیج کر اس مسجد کو منہدم کرا دیا۔ اس واقعہ سے آپ اندازہ لگائیے کہ اسلام میں فرقہ بندی کس قدر شدید اور سنگین جرم ہے کہ (اور تو اور) اگر کسی مسجد کی تعمیر سے بھی فرقہ بندی کی جھلک پڑتی ہو، تو اس مسجد کا گرا دینا ضروری ہو جاتا ہے۔ مسجد گرائی جا سکتی ہے لیکن فرقہ کی طرح نہیں پڑنے دی جا سکتی۔ کیونکہ فرقہ بندی بہ نص صریح شرک ہے اور شرکِ جلی۔'' اس سے یہ حقیقت بھی سامنے آتی ہے کہ قرآن کریم کے مطابق فرقہ کی نشانی الگ مسجد کا قیام (اور الگ نماز پڑھنا) ہے۔ فرقہ بندی کے بارے میں مزید، پرویز صاحب کے ''نظریہء حدیث'' کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

لوگوں کی تسکین کی خاطر ہی سہی:

طلوعِ اسلام اکتوبر 1979ء، ص:9 تا 21: مؤلف کی تجویز برائے قیام جماعت کے جواب میں پرویز صاحب نے لکھا کہ:۔ ''آپ کہتے ہیں کہ میں ایک جماعت ضرور قائم کروں:۔ ''لوگ اسے فرقہ تو ضرور کہیں گے لیکن کم از کم بے چین روحوں کو تو کوئی جائے سکون نظر آ سکے گی۔'' مجھے آپ کی اس سادگی پر رحم بھی آیا اور ہنسی بھی۔ آپ کا مطلب یہ ہے کہ فرقہ سازی شرک ہی سہی لیکن اس سے کچھ بے چین روحوں کی تسکین کا سامان تو مہیا ہو جائے گا۔ یہ اُسی قسم کی فرمائش ہے جیسی فرمائش بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے یہ کہہ کر کی تھی کہ ہمیں ایک بُت بنوا دیجئے تا کہ ہم اپنے جذبہء صنم پرستی کی تسکین کر سکیں۔ اس قسم کی تسکین کا سامان کوئی سامری تو بہم پہنچا سکتا ہے، وحیء خدا کا متبع ایسا نہیں کر سکتا۔ یاد رکھئے! اس قسم کا سکون وہ فریبِ نفس ہوتا ہے جو مذہبی افیون سے پیدا ہوتا ہے۔ یہ دیر، کنشت، صومعے، بتکدے، درگاہیں، خانقاہیں، تکیے، زاویے۔۔۔ سب اسی فریبِ سکون کی تلاش کے مظاہر ہیں۔ غالب کے الفاظ میں ؎

دیر و حرم ، آئینۂ تکرارِ تمنا واماندگیٔ شوق تراشے ہے پناہیں

اسلام انہیں مٹا کر وہ اطمنان دلانے کے لئے آیا تھا جو علیٰ وجہ البصیرت، دل و دماغ کے مطمئن ہو جانے کا فطری نتیجہ ہوتا ہے۔'' تھوڑا سا آگے چل کر لکھتے ہیں: ''وحدتِ امت اور اسلام لازم و ملزوم ہیں۔ مسلمانوں میں مذہبی فرقے ہوں یا سیاسی پارٹیاں یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی داعی جماعتیں، یہ سب تفرقہ کا موجب ہیں اور تفرقہ قرآن مجید کی رو سے شرک ہے۔ اگر، جیسا کہ آپ نے کہا ہے، میں بھی ایک الگ جماعت بنا لوں تو اس کا مطلب ہوگا کہ میں مذہب کے بتکدے میں ایک اور بت کا اضافہ کر دوں۔ میں اس تصور سے ڈرتا اور کانپتا ہوں۔

جماعت بنائے بغیر:

میں نے پارٹی بنائے بغیر قرآنی مفہوم کے عام کرنے کی طرح ڈالی اور توفیقِ ایزدی سے اس میں مجھے اندازہ سے بھی زیادہ کامیابی حاصل ہوئی ہے۔ اگر مذہب پرست طبقہ، جو قرآنی مملکت کے قیام میں اپنے وجود کی نفی دیکھتا ہے، اس کی

مخالفت نہ کرتا اور جھوٹے پروپیگنڈے کی بناء پر اس کے راستے میں روڑے نہ اٹکاتا تو یہ کامیابی اور بھی زیادہ ہوتی۔ آپ سوچئے! کہ ایک طرف ان کی طرف سے پیدا کردہ مشکلات اور دوسری طرف میرا یہ اصول کہ اس مقصد کے لئے نہ صدقہ نہ خیرات، نہ نذر نہ نیاز، نہ فطرانہ نہ زکواۃ، یا قربانی کی کھالوں کی رقوم جمع کرنی ہیں اور۔ نہ ہی، کسی بیرونی ملک سے امداد حاصل کرنا تو ایک طرف، خود اپنی پبلک سے بھی چندہ نہیں مانگنا۔۔ جو کچھ کرنا ہے، اپنے وسائل ہی سے کرنا ہے۔ ان موانعات اور اس کوتاہ دامانی کے باوجود اس باب میں اس قدر کامیابی کا سبب اس کے سوا کیا سمجھا جا سکتا ہے کہ یہ حق کی آواز ہے اور حق کی آواز کو اگر تھوڑا سا بھی سہارا میسر آ جائے تو وہ اپنے زورِ دروں سے بڑی تیزی سے آگے بڑھ جاتی ہے۔''

میرا مشن:

اس سے تھوڑا سا پہلے انہوں نے وضاحت کی کہ:۔ ''میری زندگی کا مشن امت میں اس احساس کا بیدار کرنا ہے کہ اسلام اور وحدتِ امت لازم وملزوم ہیں اور اس کے لئے قرآنی مملکت کا قیام ناگزیر ہے۔ میں اس فکر کو، الگ فرقہ، پارٹی یا جماعت بنائے بغیر عام کئے چلا جا رہا ہوں۔ مختلف مقامات پر جو لوگ اس فکر سے متفق ہوتے ہیں، وہ مل بیٹھتے ہیں، یہ سوچنے کے لئے کہ اس فکر کو باہمی تعاون سے عام کرنے کے لئے کیا طریقے اختیار کئے جائیں۔ اس تعاونی شکل کا نام ''بزمِ طلوعِ اسلام'' ہے، اور اسی کو میں اجتماعی کوشش سے تعبیر کرتا ہوں۔ چونکہ اس قرآنی فکر کی کامیابی سے مختلف فرقوں اور جماعتوں کا وجود باقی نہیں رہتا اس لئے ان کی طرف سے اس کی مخالفت لابدی ہے۔ مجھے ان کی اس مخالفت کا نہ کوئی گلہ ہے نہ افسوس۔ افسوس اس امر کا ہے کہ وہ اس مخالفت میں جھوٹے پروپیگنڈے اور بہتان تراشیوں سے کام لیتے ہیں۔ یہ اس لئے کہ انہیں بتایا گیا ہے کہ:۔ ''زندگی کی بعض ضرورتوں کے لئے جھوٹ بولنا واجب ہو جاتا ہے۔'' (مودودی صاحب)۔ ان ہی بہتان تراشیوں میں ایک شاخسانہ ''پرویزی فرقہ'' کا بھی ہے۔ آپ سوچئے کہ جو پرویز فرقہ سازی کو شرک قرار دیتا ہو، وہ خود ایک فرقہ بنائے گا؟۔ لیکن یہ اس کی رٹ لگائے چلے جاتے ہیں۔''

(جاری ہے)

ضرورتِ رشتہ

ایک قرآنی بیٹی جو اپنے بھائیوں کے ساتھ لندن، یو۔کے میں مقیم ہے اس کے لیے رشتہ درکار ہے۔ عمر 30 سال، LLB (پاکستان) سے کیا۔ LLM لنڈن سے کیا اس وقت لندن میں کامیاب پریکٹس کر رہی ہیں۔ لڑکے کو شادی کے بعد لنڈن میں رہنا ہوگا۔ مزید معلومات کے لیے اس نمبر پر رابطہ کریں۔

021-35854919

غلام احمد پرویزؒ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(گذشتہ سے پیوستہ)

آزادی کا قرآنی مفہوم

مسلمانوں کی حالت:

مغربی اقوام کی بے بسی کا تو یہ عالم ہے لیکن مسلمانوں کی حالت ان سے بھی عجیب تر ہے۔ صدیوں کی غلامی اور محکومی نے ان کی فکری صلاحیتوں ہی کو سلب کر دیا ہے۔ محکومیت اس لئے بدترین لعنت ہوتی ہے کہ اس میں اقبالؒ کے الفاظ میں ــــ ''جاں بھی گروِ غیر، بدن بھی گروِ غیر'' ہوتے ہیں۔ محکوم اگر کسی وقت اپنے بدن کو (حاکم قوم) کے قبضہ سے چھڑا لیتا ہے تو بھی اس کی جان اس کے قبضے میں بدستور رہتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے اس کی آنکھ سے، سُنتا ہے اس کے کانوں سے، سوچتا ہے اس کے دماغ سے۔ وہ قومِ غالب کے ہر نظریہ، مسلک یا نظام کو عرشِ معلیٰ سے نازل شدہ سمجھتا اور اس کی تقلید کو اپنے لئے موجبِ ہزار فخر ومباہات قرار دیتا ہے۔ اقوامِ غالب اپنی چچوڑی ہوئی ہڈیاں اس کی طرف پھینکتی ہیں اور یہ انہیں لپک کر اٹھاتا اور اپنے لیے خوانِ یغما سمجھتا ہے۔ حصولِ آزادی (تشکیل پاکستان) کے بعد جب ہمیں ایک نظام کی ضرورت پڑی تو ہم نے مغرب کے جمہوری نظام کو صحیفۂ آسمانی سمجھ کر تقدس کے ہاتھوں سے اٹھایا اور عقیدت کی آنکھوں کے ساتھ لگا کر اسے بکمالِ فخر ومباہات اپنے ہاں نافذ کر لیا۔ حالانکہ اُس وقت یہ نظام خود اقوام مغرب کے ہاں ناکام تجربہ ثابت ہو رہا تھا اور، جیسا کہ میں نے ابھی ابھی بتایا ہے، وہاں کے مفکرین کسی دوسرے نظام کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ہمارے ہاں شروع میں تو اس نظام کی حیثیت سیاسی سی تھی لیکن جب مذہبی پیشوائیت کے سینے میں ہوسِ اقتدار نے انگڑائی لی تو ان کی طاقت کا سرچشمہ تقلید پرست عوام کی مذہب سے وابستگی کا جذبہ تھا۔ انہوں نے اس سے فائدہ اٹھایا اور ''بحالیٔ جمہوریت'' کی تحریک چلائی۔ اس طرح اُس نظام کو جو سیکولر اقوام کے ہاں بھی مردود قرار پا چکا تھا، عین اسلامی کہہ کر عوام کو اپنے پیچھے لگا لیا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ، اُس آزادی کا حصول تو درکنار جس کے لیے اس مملکت کو حاصل کیا گیا تھا، ہم مغرب کی شکست خوردہ اقوام کے حاشیہ بردار (Camp Followers) بن کر رہ گئے۔

قرآنی نظام:

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، جمہوری نظام کی اصل واساس اس مفروضہ پر ہے کہ اقتدار کا سرچشمہ عوام ہیں۔ انہی کو حقِ حکومت پہنچتا ہے اور ان کے نمائندوں کی اکثریت کو آئین وقانون سازی کا حق حاصل ہوتا ہے۔ قرآن سرے سے اس

مفروضہ کو باطل قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنا محکوم بنائے ___ خواہ وہ ایک انسان ہو یا انسانوں کا کوئی گروہ (78:3) قرآنِ کریم کے اس اوّلین اصول کی رو سے ایک طرف مغربی نظامِ جمہوریت خلافِ اسلام قرار پاجاتا ہے اور دوسری طرف اس سے آزادی اور غلامی کا صحیح تصوّر سامنے آجاتا ہے۔ اس کی رو سے انسانوں کی حکومت خواہ وہ اپنی قوم کی ہو اور خواہ کسی دوسری قوم کی، بہرحال غلامی ہے۔ اس سے علامہ اقبالؒ کے اس جواب کی حقانیت نکھر کر سامنے آجاتی ہے جو انہوں نے (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) کو دیا تھا اور جس میں کہا تھا کہ اگر انگریز ہندوستان سے چلا جائے اور اس کی جگہ اہلِ ہند کی اپنی حکومت قائم ہوجائے تو ہندو کے نزدیک بیشک یہ آزادی قرار پا جائے گی۔ لیکن مسلمان کے نزدیک، جو قرآن کا متبع ہے، یہ بدستور غلامی کی غلامی رہے گی اور ایک باطل نظام کو ہٹا کر اس کی جگہ دوسرے باطل نظام کا قیام۔

حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے:

اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں تو پھر یہ حق کسے حاصل ہے۔ اس لئے کہ قرآن کا یہ منشاء تو ہو نہیں سکتا کہ انسانوں میں نظامِ حکومت سرے سے ہو ہی نہ۔ وہ انسانوں کی تمدّنی زندگی کے لیے نظامِ حکومت ضروری قرار دیتا ہے۔ اس کا کہنا یہ ہے کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل ہے۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) وہ اپنے اس حقِ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝ (18:26) بنا بریں۔ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ (12:40)۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ (12:40) یہی محکم نظامِ حیات ہے لیکن اکثر لوگ اس بات کو سمجھتے نہیں اور وہ انسانی حکومتوں کی ہیئت (Form) بدل کر مطمئن ہوجاتے ہیں کہ ہم نے غلامی کی زنجیریں توڑ کر آزادی حاصل کر لی ہے۔ ہیئت کے بدل دینے سے حقیقت نہیں بدل جاتی۔

لیکن اس سے وہ خدشہ سامنے آجاتا ہے جس سے مجروح ہو کر اہلِ مغرب نے نظامِ جمہوریت اختیار کیا تھا۔ وہاں مذہبی پیشوائیت نے یہی کہا تھا کہ حقِ حکومت کسی انسان کو حاصل نہیں، خدا کو حاصل ہے، لیکن خدا اپنی حکومت اپنے نمائندگان کے ذریعے قائم کرتا ہے جنہیں وہ اپنے اختیارات تفویض کر دیتا ہے۔ ہم اس کے نمائندے ہیں، اس لئے ہماری حکومت انسانوں کی حکومت نہیں۔ خدا کی حکومت ہے۔ اس سے تھیاکریسی کا وہ نظامِ حکومت وجود میں آگیا جو ملوکیت سے بھی بدتر تھا۔ ملوکیت کے خلاف تو بغاوت بھی کی جاسکتی تھی جس کی نوعیت بہرحال سیاسی سمجھی جاتی تھی۔ خدا کے ان (مزعومہ) نمائندوں کے خلاف بغاوت، خود خدا کے خلاف بغاوت قرار پاجاتی تھی۔

اس کا عملی ذریعہ کتاب اللہ کی حاکمیت ہے:

قرآن نے کہا کہ خدا کی حکومت، خدا کی کتاب (یعنی قرآن کریم) کے ذریعے قائم ہوگی جس میں کسی انسان کا کوئی دخل

نہیں ہوگا، کیونکہ خدا اپنے اختیارات کسی کو تفویض نہیں کیا کرتا۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لیے خود زبان نبویؐ سے کہلوایا گیا کہ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ط (6:114) ''کیا تم لوگ چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور حاکم کی طلب وجستجو کروں، حالانکہ اس نے اپنی کتاب نازل کر دی ہے جو مفصل ہے۔'' یہاں سے دو باتیں واضح ہو گئیں۔ ایک یہ کہ تھیاکریسی اس لئے وجود میں آئی تھی کہ خدا کی کوئی ایسی کتاب موجود نہیں تھی جو ضابطہ زندگی بن سکتی۔ اس لئے جب خدا کی حکومت کا اصول تسلیم کر لیا جاتا تھا تو اس کے بعد لوگوں کو لازماً مذہبی پیشوائیت کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ دوسرے یہ کہ اس حقیقت کا اعلان خود ذاتِ رسالت مآب ﷺ سے کرانے میں حکمت یہ تھی کہ دُنیا میں اگر کوئی انسان خدا کا نمائندہ بن سکتا تھا تو اس کا اولین حق بہر حال رسولؐ اللہ کو پہنچتا تھا جب حضورؐ نے بھی یہ فرما دیا کہ خدا کی حکومت کے معنی اس کی کتاب کی حکومت ہے تو انسانی نمائندگی یا خدائی اختیارات کی تفویض کا نظریہ خود بخود باطل قرار دیا گیا۔ اس نظریہ کی رو سے حکومت، خدا کی کتاب کے احکام وقوانین نافذ کرنے کی ایجنسی قرار پا گئی۔ اس سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ اس نظریہ کی صداقت کا تسلیم کر لینا ایمان قرار پایا اور اس سے انکار، کفر۔ سورۃ مائدہ میں ہے:

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (5:44)

جو لوگ کتاب اللہ کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، وہی کافر ہیں۔

اور اس کے ساتھ ہی رسولؐ اللہ سے فرما دیا گیا کہ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:49) ''ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔'' گویا یہاں پھر دہرا دیا کہ یہ حکومت تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ یہ کتاب اللہ کی حکومت ہوگی۔ قرآنِ کریم نے خدا کے سوا ہر اتھارٹی کو طاغوت کہہ کر پکارا ہے، اور کفر اور ایمان کے اس فرق کو ان الفاظ میں بیان کر دیا ہے کہ فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ لَا انْفِصَامَ لَهَا ط (2:256) ''جو خدا پر ایمان لایا اور اس نے طاغوت سے کفر برتا تو اس نے ایسا محکم سررشتہ تھام لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔'' اور اس ''کفر بالطاغوت'' کی تشریح ان الفاظ سے کر دی کہ ''کیا تم نے ان لوگوں کی حالت پر بھی غور کیا جو بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ ہم کتاب اللہ پر ایمان لے آئے ہیں۔ لیکن عملاً ان کی حالت یہ ہے کہ اَنْ يَّتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ (4:60) ''اپنے معاملات کے فیصلے طاغوت سے کرائیں حالانکہ انہیں حکم یہ دیا گیا تھا کہ وہ طاغوت سے کفر برتیں۔'' یہاں سے بات بالکل واضح ہو گئی کہ خدا پر ایمان سے عملاً مفہوم یہ ہے کہ حکومت کے لیے اس کی کتاب کو اتھارٹی تسلیم کیا جائے۔ اگر اس کے سوا کوئی اور اتھارٹی تسلیم کر لی گئی تو یہ کفر ہوگا۔ اس کتاب کے متعلق ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ اس مفصل کہا گیا ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ط لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:115) ''خدا کے کلمات (قوانین خداوندی) صدق وعدل کے ساتھ مکمل ہو گئے۔ یہ قوانین غیر متبدل ہیں۔'' بالفاظ دیگر یہ ضابطۂ خداوندی مفصل، مکمل اور غیر متبدل ہے۔ اس کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے محفوظ بھی (18:9)۔

لیجئے! جس قسم کے ضابطۂ حیات کی مفکرینِ مغرب کو تلاش تھی لیکن وہ انہیں کہیں سے ملتا نہیں تھا، وہ سامنے آ گیا۔ جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، مفکرین مغرب اپنے عقلی و تجرباتی طریق سے اس نتیجہ تک تو پہنچ گئے ہیں کہ اس قسم کا ضابطہ اور نظام، انسانی مشکلات کا حل پیش کر سکتا ہے لیکن انہیں اس کا سراغ نہیں ملتا کہ وہ ضابطہ ملے گا کہاں سے؟ اگر ان کے سامنے قرآن اپنی حقیقی شکل میں آ جائے تو وہ یقیناً اسے لپک کر اٹھا لیں۔ اس کے راستے میں رکاوٹ کیا ہے اسے میں ذرا آگے چل کر بیان کروں گا۔ جو کچھ میں نے اس وقت تک کہا ہے اس سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آ جاتی ہے کہ مسلمانوں کے نزدیک خدا کی کتاب کے تابع زندگی بسر کرنا ہی آزادی ہے۔ اس میں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ حکومت کس کے ہاتھ میں قائم ہوتی ہے۔ اگر حکومت خدا کی کتاب کی نہیں تو یہ آزادی نہیں، محکومی ہے، خواہ اس مملکت میں اقتدار خود اپنی قوم کے ہاتھوں میں ہی کیوں نہ ہو۔ انسانوں کو آزادی صرف کتاب اللہ کے تابع رہنے سے مل سکتی ہے۔ ارشاد ہے۔ لَمْ يَكُنِ الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِينَ مُنفَكِّينَ حَتّٰى تَأْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ ۝ (98:1) ''اہل کتاب ہوں یا مشرکین، کسے باشد، انہیں کبھی آزادی نصیب نہیں ہو سکتی تھی تاوقتیکہ ان کے پاس واضح حقیقت نہ آ جاتی ___ یعنی اللہ کا رسول ﷺ نہایت پاکیزہ صحائف لے کر ___ فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ ۝ (98:3) وہ صحیفہ آسمانی جس میں نہایت محکم قوانین ہیں۔'' نوعِ انسان کو حقیقی آزادی اس کتاب کی اطاعت سے مل سکتی تھی۔ اسی سے انسانوں کی حکومت کی وہ زنجیریں ٹوٹ سکتی تھیں جن میں نوعِ انسان جکڑی چلی آ رہی تھی اور اسی سے وہ بوجھل سلیں ان کے سر سے اتر سکتی تھیں۔ جن کے بوجھ تلے وہ اس بُری طرح دبی ہوئی تھی۔ (7:157)

استخلاف فی الارض:

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اسلام میں حکومت، قرآنی احکام و اقدار کے نفاذ کی ایجنسی ہے۔ بالفاظ دیگر اسے قانون سازی کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس کا منصب قوانینِ خداوندی کا نفاذ ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اس کی حیثیت صرف اجرائیہ یا انتظامیہ کی رہ جاتی ہے۔ قرآنی اصطلاح میں اسے ''استخلاف فی الارض'' کہا جاتا ہے۔ یہیں سے لفظ خلیفہ ہے۔ (ضمناً) یہ جو ہمارے ہاں عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا تو یہ تصور غیر قرآنی ہے۔ قرآن میں کہیں نہیں آیا کہ خدا نے آدم کو اپنا خلیفہ بنایا ہے۔ یہ عیسائیت کا تصور ہے جس کی رو سے یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ خدا نے اپنے اختیارات اپنے نمائندوں (کلیسا) کو تفویض کر دیئے ہیں۔ اس نکتہ کی وضاحت پہلے بھی کی جا چکی ہے۔ اسی تصور سے متاثر تھا وہ ذہن جس نے ایک دفعہ حضرت صدیقِ اکبرؓ کو خلیفۃ اللہ کہہ کر پکارا تو آپ نے اُسے سختی سے روک دیا اور فرمایا کہ خدا کا خلیفہ کوئی نہیں ہو سکتا۔ میں خلیفۃ الرسول ﷺ (یعنی رسول کا جانشین) ہوں۔ اور حضرت عمرؓ نے اتنے سے التباس کے امکان کو بھی ختم کرنے کے لیے خلیفہ کے بجائے امیر المومنین کا لقب اختیار فرمایا۔

بہرحال بات ''استخلاف فی الارض'' کی ہو رہی تھی جس سے مراد ہے وہ نظامِ حکومت جس کی رُو سے قرآنی احکام و اقدار کو نافذ کیا جائے۔ زمانہ قدیم میں، جب ہنوز اقتدار کا مرکز شخصیتیں ہوتی تھیں، اللہ تعالیٰ نے افراد کو خلیفہ کہہ کر پکارا۔ سورہ ص

میں حضرت داؤدؑ کے متعلق ہے یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ (38:26) ''اے داؤد! ہم نے تمہیں ملک میں خلیفہ بنایا ہے سو تم لوگوں میں الحق (وحیٔ خداوندی) کے مطابق حکومت قائم کرو۔'' لیکن جب نوعِ انسان اپنے بچپن کی منزلیں طے کر لینے کے بعد عالمِ شباب تک آ پہنچی تو شخصیتوں کا دور ختم ہو گیا اور عالمگیر انسانیت کے لیے وحی کی راہنمائی میں اپنے معاملات آپ طے کرنے کا نیا دور شروع ہو گیا۔ تاریخ میں حضور رسالت مآب ﷺ اُس دورِ کہن کے اختتام اور عصرِ جدید کے آغاز کے نقطۂ اتصال پر فائز نظر آتے ہیں۔ ختم نبوت ﷺ کا اعلان اسی انقلاب کی تمہید ہے۔ چنانچہ اس مقام پر پہنچ کر استخلاف فی الارض، اشخاص کے بجائے اُمتوں کی طرف منتقل ہو گیا۔ کیا آپ نے اس پر کبھی غور فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤدؑ کے متعلق تو فرمایا کہ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْاَرْضِ (38:26) لیکن حضور خاتم الانبیاء ﷺ کے زمانے میں کہا کہ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ (24:55) ''تم میں سے جو لوگ وحی کی ابدی صداقتوں کو تسلیم کریں گے اور ان کے اعمال اس پیمانے پر پورے اتریں گے تو انہیں استخلاف فی الارض عطا کیا جائے گا۔ یہ خدا کا وعدہ، یعنی اس کا غیر متبدل قانون ہے۔'' یعنی اب استخلاف فی الارض اشخاص کے بجائے امتوں کے حصے میں آئے گا۔ سوچیے عزیزانِ من! کہ اس انقلابِ عظیم کا اعلان آج سے چودہ سو سال پہلے اُس زمانے میں ہوا جب ساری دنیا میں شخصی حکومتوں کا دور دورہ تھا اور افراد کی جگہ اُمتوں کی حکومتوں کا تصور تک کسی کے ذہن میں نہیں آ سکتا تھا۔ روسو کا فلسفہ اور انقلاب فرانس تو ابھی کل کی بات ہے۔ قرآنِ کریم کے تجویز کردہ نظام کی رو سے استخلاف فی الارض، اُمتِ مسلمہ (یعنی امت محمدیہؐ) کے حصے میں آیا۔ اس اُمت سے کہہ دیا گیا کہ ان احکام و قوانین کی کارفرمائی کے لیے جو عملی پروگرام تجویز اور اختیار کیا جائے گا۔ وہ بھی کسی ایک فرد کا طے کردہ نہیں ہوگا۔ وہ تمہارے باہمی مشورے سے طے ہوگا ــــ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)۔ حتیٰ کہ اس نظام کے سربراہ اوّل، جو بہرحال رسولؐ اللہ ہی ہو سکتے تھے، سے بھی تاکید کر دی کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (3:159) ''مملکت کے معاملات طے کرنے کے لئے افرادِ امت سے مشورہ کیا کرو۔'' ان احکامات کی رُو سے، قرآنِ کریم نے ہر قسم کی شخصی حکومت ــــ ملوکیت یا آمریت ــــ اور ان کے ساتھ ہی تھیاکریسی کا خاتمہ کر دیا۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ استخلاف فی الارض، یعنی نظامِ حکومت، مقصود بالذات نہیں تھا، ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ تھا اور وہ بلند مقصد تھا، قرآنی اصول و اقدار اور احکام و قوانین کا نفاذ و اجراء، سورہ النور میں جہاں یہ کہا گیا ہے کہ ایمان و اعمال صالحہ کے نتیجہ میں تمہیں استخلاف فی الارض، حاصل ہوگا، اس کے ساتھ ہی اس کی بھی وضاحت کر دی کہ یہ استخلاف اس لئے دیا جائے گا۔ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ (24:55) ''تاکہ اس سے اس دین کا تمکن ہو جائے (وہ نظامِ زندگی قائم اور (Establish ہو جائے) جسے تمہارے لئے پسند کیا گیا ہے۔ مملکت کے اس فریضہ کو دیگر مقامات میں ''اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ط'' (22:41) کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ان امور کا نافذ کرنا جنہیں قرآن کی سندِ قبولیت حاصل ہو، اور اُن سے لوگوں کو روکنا جو اس کے نزدیک ناپسندیدہ ہوں سورۃ الحج میں ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر:

اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَہَوۡا عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ (22:41)

یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں تمکن حاصل ہوگا تو اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ان کا فریضہ ہوگا اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر ان کے تمکن کا مقصد۔ اس میں تمام معاملات انجامِ کارِ خدائی پروگرام کی تکمیل کے لیے سرانجام پائیں گے۔

پھر دُہرا دیا جائے کہ چونکہ یہ تمکن فی الارض، پوری کی پوری اُمت کو حاصل ہوگا نہ کہ کسی ایک فرد یا گروہ کو اس لئے ''امر بالمعروف ونہی عن المنکر'' کا فریضہ بھی پوری کی پوری اُمت کا ہوگا نہ کہ کسی ایک گروہ کا۔ سورۃ آل عمران میں ہے (3:109، 9:71، 9:112) ''تم بہترین اُمت ہو جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ تمہارا فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے'' یہی اس اُمت سے کہا گیا اور یہی اس نظام کے سربراہ اوّل حضور نبی اکرمؐ سے (7:157)۔ متعدد مقامات پر اس کی بھی وضاحت کر دی کہ اس نظام میں اُمت بلکہ خود رسول اللہ ﷺ کو بھی اس کا اختیار نہیں ہوگا کہ وہ خدا کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات (قرآن کریم) میں کسی قسم کا ردوبدل کر سکیں۔ مخالفین کہتے کہ ہم اس نظام میں شریک ہونے کے لیے تیار ہیں بشرطیکہ آپؐ اس ضابطہ میں کچھ تبدیلیاں کر دیں۔ اس کے جواب میں حضورؐ فرماتے کہ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَہٗ مِنۡ تِلۡقَآیِ نَفۡسِیۡ ۚ (10:15) ''یہ میرے حیطۂ اختیار ہی میں نہیں کہ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر دوں۔'' اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ ۚ (10:15) ''میں تو خود بھی اسی کا اتباع کرتا ہوں، جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔'' اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ ﴿۱۵﴾ (10:15) ''اگر میں بھی اس کی نافرمانی کروں تو اس کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔''

یہاں سے ایک اور اہم نکتہ ہمارے سامنے آتا ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا کہ میں خود اسی ضابطۂ قوانین خداوندی کا اتباع کرتا ہوں۔ اگر میں بھی اس کی خلاف ورزی کروں تو اس کے مواخذہ سے بچ نہیں سکتا۔ اس سے واضح ہے کہ اطاعت ضابطۂ خداوندی (قرآنِ کریم) ہی کی ہے۔ اسلامی نظامِ مملکت اس کی اطاعت کرانے کی مشینری وضع کرتا ہے۔

کسی انسان کو حقِ حکومت حاصل نہیں:

ان تصریحات کے بعد ہم اس ارشادِ خداوندی کو سامنے لاتے ہیں جو نظامِ حکومتِ اسلامی کی اساس و بنیاد، اس موضوع پر حرفِ آخر اور تمام نوعِ انسانی کے لیے حقیقی آزادی کا منشور (Charter) ہے۔ اسے غور سے سنیئے۔ ارشاد ہے:

مَا کَانَ لِبَشَرٍ اَنۡ یُّؤۡتِیَہُ اللّٰہُ الۡکِتٰبَ وَالۡحُکۡمَ وَالنُّبُوَّۃَ ثُمَّ یَقُوۡلَ لِلنَّاسِ کُوۡنُوۡا عِبَادًا لِّیۡ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ وَلٰکِنۡ کُوۡنُوۡا رَبّٰنِیّٖنَ بِمَا کُنۡتُمۡ تُعَلِّمُوۡنَ الۡکِتٰبَ وَبِمَا کُنۡتُمۡ تَدۡرُسُوۡنَ ﴿۷۹﴾ (3:79)

کسی انسان کو اس کا حق نہیں پہنچتا ___ خواہ خدا اسے ضابطۂ قوانین یا حکومت یا نبوت بھی کیوں نہ عطا کر دے کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں، میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تم اس کتاب کی

اطاعت کے ذریعے، جسے تم پڑھتے پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہو۔ اللہ کے محکوم (ربّانی) بن جاؤ۔

یہ آیۂ جلیلہ، اسلامی نظامِ حکومت کا دستور اساسی، یا نوعِ انسان کے لئے ''آزادی کا چارٹر'' ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ اطاعت یا محکومیت کسی انسان (یا انسانوں کے گروہ) کی جائز نہیں۔'' خواہ وہ اطاعت انسانوں کے وضع کردہ ضابطۂ قوانین کی رو سے ہو (کتاب) خواہ انتظامیہ کی ہو (حکم) حتیٰ کہ نبی کی بھی نہیں (نبوت)۔ اسلامی نظام میں اطاعت اور محکومیت، کتاب اللہ کی ہوگی۔ وہ نظام جس کی خصوصیت یہ ہوگی کہ ؎

کس دریں جا سائل و محروم نیست عبد و مولا، حاکم و محکوم نیست

یہی تھا وہ مقصد جس کے لیے اس خطۂ زمین کو حاصل کیا گیا تھا لیکن جو آج تک اس مقصد سے محروم ہے۔ یہاں ایک دن کے لئے بھی کتاب اللہ کی حکومت قائم نہیں ہوئی۔ لہٰذا، ہمیں وہ آزادی نصیب ہی نہیں ہوئی جس کی ضامن خدا کی یہ کتاب ہے اور جو وجۂ شرف انسانیت ہے۔ قرآنی آزادی تو ایک طرف، یہاں تو مغرب کا نظامِ جمہوریت بھی اپنی حقیقی شکل میں قائم نہیں ہوسکا۔ یہاں کسی نہ کسی رنگ میں آمریت ہی کا دور دورہ رہا جو غلامی کی بدترین صورت ہوتی ہے۔ ہماری مذہبی پیشوائیت، آمریت کے خلاف تو اعلانِ جنگ کرتی ہے لیکن مغربی جمہوریت کو عین مطابقِ اسلام قرار دیتی ہے جس میں اکثریت کے فیصلوں کو برحق تسلیم کیا جاتا ہے۔

پاکستان میں اقامتِ دین کے سب سے بڑے مدعی جماعت اسلامی کے بانی ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ہیں۔ وہ مطالبۂ پاکستان کی مخالفت میں ایک دلیل یہ بھی دیا کرتے تھے کہ:

> جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ اگر مسلم اکثریت کے علاقے ہندو اکثریت کے تسلط سے آزاد ہو جائیں اور یہاں جمہوری نظام قائم ہو جائے تو اس طرح حکومتِ الٰہی قائم ہو جائے گی۔ ان کا گمان غلط ہے۔ دراصل اس کے نتیجے میں جو کچھ حاصل ہوگا۔ وہ صرف مسلمانوں کی کافرانہ حکومت ہوگی بلکہ اس سے بھی زیادہ قابلِ لعنت۔
>
> (مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم، ص: 131)

اکثریت کا نظام:

> پاکستان میں آکر انہوں نے (صدر ایوب کے دور کے انتخابات کے زمانے میں) اپنے اس مسلک کا اظہار فرمایا کہ: اگر ایک ہندو جمہوری نظام کی حمایت کرتا ہے تو اسے میری تائید حاصل ہوگی۔ اس لئے کہ اس نے یہ اصول تسلیم کرلیا ہے کہ ملک کا نظام اکثریت کے نظریہ کے مطابق ہونا چاہئے۔
>
> (امروز مورخہ 20 اگست 1963ء)

اتنا ہی نہیں مودودی صاحب نے دین کے معاملے میں بھی اکثریت کے اصول کو حق کا معیار قرار دے دیا۔ انہوں نے کہا ہے کہ:

> اگر شریعت کو ملک کا دستور اور آئین بنانا ہے (جس سے کوئی مسلمان انکار کی جرأت نہیں کرسکتا) تو

جمہوریت کے مسلم قاعدہ (1) کے مطابق یہاں شریعت کی وہی تعبیر دستور اور آئین کی شکل اختیار کرے گی جسے مسلمانوں کی عظیم اکثریت معتبر مانتی ہے اب یہ ظاہر ہے کہ اس ملک میں مسلمانوں کی عظیم اکثریت حنفی ہے۔۔۔لہٰذا اس کا قانون حنفی تعبیرِ شرعت پر مبنی ہوگا۔(ترجمان القرآن، بابت جون، جولائی 1952ء)

چنانچہ اب ملک میں حنفی فقہ پبلک لاز کی حیثیت سے نافذ کی جارہی ہے۔جیسا کہ میں متعدد بار واضح کر چکا ہوں، میرا تعلق کسی مذہبی فرقے سے نہیں اس لئے میں نہ کسی فرقہ کی فقہ کے حق میں ہوں نہ کسی فرقہ کی فقہ کے خلاف۔میں تو قرآن مجید کا طالبعلم ہوں اور میرا فریضہ یہ ہے کہ ہر پیش آمدہ معاملے کے متعلق یہ واضح کردوں کہ اس کی بابت قرآن مجید کا کیا فیصلہ ہے۔ قرآن مجید کی رو سے اکثریت یا اقلیت کے معیارِ حق و باطل قرار پانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''اکثریت'' کے متعلق تو وہ واضح الفاظ میں کہتا ہے:

وَاِنْ تُطِعْ اَكْثَرَ مَنْ فِي الْاَرْضِ يُضِلُّوْكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ ۝ (6:116)

اگر تو دنیا کے باشندوں کی اکثریت کی اطاعت کرنے لگ جائے گا تو وہ تجھے اللہ کے راستے سے گمراہ کردیں گے۔وہ محض ظن وتخمین کا اتباع کرتے ہیں اور قیاس آرائیوں سے کام لیتے رہتے ہیں۔

اور تو اور خود مودودی صاحب بھی اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ:

اسلام تعداد کی کثرت کو حق کا معیار تسلیم نہیں کرتا۔اسلام کے نزدیک یہ ممکن ہے کہ ایک اکیلے شخص کی رائے پوری مجلس کے مقابلے میں برحق ہو اور اگر ایسا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ حق کو اس لئے چھوڑ دیا جائے کہ اس کی تائید میں ایک جمِ غفیر نہیں۔(اسلام کا نظریہ سیاسی، ص:46۔45)

لہٰذا کسی عقیدہ، نظریہ یا مسلک کے متعلق یہ کہنا کہ چونکہ اکثریت اس کے حق میں ہے اس لئے وہ برحق ہے، مغرب کے نظامِ جمہوریت کے تو مطابق ہے لیکن قرآنِ کریم کے یکسر خلاف۔کیا یہ مقامِ حیرت نہیں کہ مغرب کے مفکرین تو اس اصول کو باطل قرار دے رہے ہیں اور ہمارے ہاں کے مدعیانِ اقامتِ دین اسے حق کا معیار بتا رہے ہیں؟ مغرب کا مشہور مفکر برفا اس باب میں لکھتا ہے:

ایک انسان کا دوسرے انسان پر اقتدار و اختیار خواہ وہ کسی رنگ میں ہو استبداد ہے۔قوت کسی شکل میں ہو اس کے یہی نتائج ہوں گے۔وہ جاہ ومنصب کی ہو یا پنجہ فولاد کی۔دولت کی ہو یا ذہنی برتری کی۔کسی افسر کی ہو یا حاکم کی۔کسی پادری کی ہو یا پروہت کی۔قوت بہرحال قوت ہے اور فساد کی جڑ۔اس کا لازمی نتیجہ ظلم اور بیدادگری ہوتا ہے۔ان سب میں سب سے زیادہ خراب قوت وہ ہے جو اکثریت محض اپنی تعداد کے زور پر

(1) یعنی مغربی جمہوریت کا مسلم قاعدہ، دین میں حق و باطل کا معیار قرار دیا جارہا ہے:(استغفراللہ)

اقلیت کے خلاف استعمال کرتی ہے۔ (The Making of Humanity, P.273)

قرآنِ کریم کا ایک ارشاد ہے جس پر غور کرنے سے ایک مسلمان کپکپا اٹھتا ہے۔ وہ ارشاد یہ ہے:

وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ (12:106)

ایمان کا دعویٰ کرنے والوں میں سے اکثر کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ اس دعویٰ کے باوجود مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔

میں نہ کسی کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کیا کرتا ہوں نہ کسی کو مشرک قرار دیا کرتا۔ میں اس قسم کی جرأت کے خلاف خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ لیکن قرآنِ کریم جن امور کو شرک قرار دیتا ہے ان کی وضاحت فریضہ خداوندی سمجھتا ہوں۔ سوال یہ ہے کہ وہ کون سی ایسی بنیادی گمراہی ہے جس سے انسان دعویٰ ایمان کے باوجود مشرک کا مشرک رہتا ہے؟ اس کی وضاحت قرآنِ کریم نے خود کر دی۔ سورہ الزمر میں ہے:

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ (39:45)

جب خالصتاً خدا کے قانون کی بات کی جاتی ہے تو جو لوگ آخرت کے منکر ہیں انہیں یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے۔ لیکن جب اس کے ساتھ اوروں کو بھی ملا دیا جائے تو وہ بہت خوش ہو جاتے ہیں۔

اس کی وضاحت اس سے اگلی سورۃ میں ان الفاظ میں کر دی کہ:

ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗٓ اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ كَفَرْتُمْ ۚ وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ تُؤْمِنُوْا ۭ فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ ﴿۱۲﴾ (40:12)

تمہارا یہ انجام اس لئے ہوا کہ جب تمہیں خالصتاً خدا کی طرف بلایا جاتا تھا تو تم اس سے انکار کرتے تھے لیکن جب اس کے ساتھ انسانوں کو ملا دیا جاتا تھا تو تم ایمان لے آیا کرتے تھے۔ حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ حقِ حکومت صرف خدا کو حاصل تھا۔ کبریائی بھی اس کی تھی اور قتدار اعلیٰ بھی اسی کا۔

یعنی وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿۲۶﴾ (18:26) وہ اپنے احکام میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔ دوسری جگہ فرمایا:

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ ۔۔۔ (42:21)

کیا ان لوگوں نے خدا کے ایسے شریک مقرر کر رکھے ہیں جو ان کے لئے قوانین شریعت وضع کرتے ہیں حالانکہ اس کے لئے خدا نے کوئی اجازت نہیں دی۔

یہ کون لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کے اختیارِ مطلق میں شریک ہو جاتے ہیں۔ اس کی وضاحت خود حضور نبی اکرمؐ نے فرما دی۔

جب یہ آیت نازل ہوئی: اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۔۔۔(9:31)

''ان اہلِ کتاب نے اپنے علماء اور مشائخ کو خدا سے ورے ہی خدا بنا رکھا ہے۔''

تو ان کی طرف سے یہ اعتراض ہوا کہ ہم نے انہیں خدا تو نہیں بنا رکھا۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے فرمایا کہ کیا یہ واقعہ نہیں کہ یہ تمہارے لئے قوانینِ شریعت وضع کرتے ہیں۔ جسے یہ حلال قرار دے دیتے ہیں تم اسے حلال سمجھنے لگ جاتے ہو۔ جسے حرام کہہ دیتے ہیں تم اسے حرام سمجھ لیتے ہو۔ یہی تو انہیں خدا بنا دیتا ہے!

اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ: اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ۔۔۔(29:51)

''کیا ان کے لیے یہ کافی نہیں کہ ہم نے تجھ پر یہ کتاب نازل کی ہے جسے ان کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے؟''

یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا کہ کیا دین کے معاملہ میں کتاب اللہ کافی نہیں ہے؟ ہمارے احبار و رہبان (مذہبی پیشوا) سینے پر ہاتھ مار کر دھڑلے سے کہتے ہیں کہ یہ کتاب کافی نہیں۔ ''مثلہ معہ'' اس کے ساتھ اس کی مثل اور چیزیں بھی ضروری ہیں۔ کہا تو ''مثلہ معہ'' تھا ــــ یعنی اس کے ساتھ اس کی مثل لیکن رفتہ رفتہ ''اس کے ساتھ'' کا تصور ختم ہو گیا اور باقی صرف ''خارج از قرآن'' رہ گیا۔ چنانچہ اب دین کے لیے ''خارج از قرآن'' کافی قرار پا چکا ہے۔ قرآن کا نام تبرکاً باقی رہ گیا ہے۔

احکامِ خداوندی میں انسانوں کو شریک کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جو منفرد خصوصیات احکامِ خداوندی کو حاصل ہیں انسانوں کے وضع کردہ قوانین و احکام کو انہی صفات کا متصف قرار دے دیا جائے۔ احکام و قوانینِ خداوندی کی بنیادی خصوصیات ابدیت اور لاتبدیلیت ہیں۔ یعنی وہ ہر زمانے میں نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے جاتے ہیں۔ اور ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ احکامِ فقہ کے مرتب کرنے والے آئمۂ کرامؒ کا مقام کتنا ہی مقام بلند کیوں نہ ہو، ان کے احکام نہ ابدی ہو سکتے ہیں نہ غیر متغیر۔ انہیں ایسا قرار دینا قرآنِ کریم کی نصوص صریحہ کے مطابق شرک فی التوحید ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس سے، اور تو اور، خود مودودی صاحب بھی متفق ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> مجتہد خواہ کتنا ہی باکمال کیوں نہ ہو زمان و مکان کے تعینات سے بالکل آزاد نہیں ہو سکتا۔ نہ اس کی نظر تمام ازمنہ و احوال پر وسیع ہو سکتی ہے۔ لہٰذا اس کے تمام اجتہادات کا تمام زمانوں اور تمام حالات کے مطابق ہونا غیر ممکن ہے۔ (تفہیمات، حصہ دوم، ص: 426) انسان خواہ سراسر اپنی رائے سے اجتہاد کرے یا کسی الہامی کتاب سے اکتساب کرے، دونوں صورتوں میں اس کا اجتہاد دنیا کے لئے دائمی قانون اور اٹل قاعدہ نہیں بن سکتا کیونکہ انسانی تعقل اور علم ہمیشہ زمانہ کی قیود سے مقید ہوتا ہے۔ (تنقیحات، ص: 120)

اس کے برعکس:

> تمام زمان و مکان کے قیود سے آزاد اگر کوئی ہے تو وہ صرف خداوندِ عالم ہے جس کے پاس حقیقی علم ہے اور جس کے علم میں زمانہ کے تغیرات سے ذرّہ برابر کوئی تغیر واقع نہیں ہوتا۔ (تنقیحات، ص: 120)

لیکن مصیبت یہ ہے کہ یہ حضرات کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ! یہاں فقہی قوانین کو شریعتِ خداوندی کہہ کر نافذ کیا جا رہا ہے ظاہر ہے کہ یہ فقہ خدا کی نہیں، انسان کی وضع کردہ ہے۔ پھر ان فقہی قوانین پر اسلامی نظریاتی کونسل کے ارکان نے غور وفکر کیا۔ یہ بھی بہرحال انسان ہیں۔ لیکن دیکھئے کہ انسانوں کے ان مرتب کردہ قوانین کے متعلق کیا کہا جا رہا ہے؟ مودودی صاحب نے اپنے ان قوانین کے سلسلہ میں ایک انٹرویو میں کہا کہ اب ہمارا فریضہ یہ ہے کہ:

عوام الناس کو یہ احساس دلائیں کہ اب یہاں خدا کا قانون جاری کیا جا رہا ہے۔

(ترجمان القرآن، بابت اپریل 1979ء، ص:13)

استغفر اللہ، ہزار بار استغفر اللہ، انسانوں کے مرتب کردہ قوانین کو خدا کا قانون کہنا ایسا شرک جلی ہے جس کی جسارت ہم جیسے گنہگاروں کے تو حیطۂ تصور میں بھی نہیں آسکتی! اس قسم کی جسارت تو آئمہ فقہ نے بھی نہیں کی تھی۔ ان میں سے کسی نے بھی اپنی فقہ کو ''قانونِ خداوندی'' کہہ کر نہیں پکارا تھا۔ انہوں نے یہی کہا تھا کہ یہ ان کے اپنے مرتب کردہ قوانین ہیں۔ لہٰذا جو قوانین یہاں نافذ کئے جا رہے ہیں وہ حکومتِ پاکستان کے قوانین ہیں۔ قوانینِ خداوندی نہیں ہیں۔ قوانینِ خداوندی تو خدا کی کتاب میں ہوتے ہیں (اور ہیں) قرآن کریم نے اہلِ کتاب کے متعلق کہا تھا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ: يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ (2:79) ''یہ خود قوانین وضع کرتے ہیں اور انہیں قوانین خداوندی کہہ کر مشہور کرتے ہیں اور مقصد اس سے یہ ہوتا ہے کہ کچھ مفاد حاصل کر لئے جائیں۔'' سوچیئے کہ کیا یہاں بھی بعینہٖ یہی کچھ نہیں ہو رہا۔

اس سے بھی آگے بڑھئے۔ ان قوانین کے نفاذ پر مودودی صاحب نے ایک بڑا اہم اعلان فرمایا تھا جو ان کی جماعت کے ترجمان ''ایشیاء'' بابت 11 فروری 1979ء کے ص:9 پر شائع ہوا تھا۔ اس میں انہوں نے ان قوانین کی اہمیت بتاتے ہوئے کہا تھا:

انسانی قوانین کی خلاف ورزی کرنا اور چیز ہے اور خدا تعالیٰ اور رسولؐ کے قانون کو توڑنا بالکل ہی دوسری چیز ہے۔ اس سے تو آدمی کا ایمان خطرے میں پڑ جاتا ہے اور وہ خدا کے غضب کا مستحق بن جاتا ہے۔

تھیاکریسی:

سیکولر نظامِ حکومت میں انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی اطاعت اختیار کی جاتی ہے، لیکن ان کی خلاف ورزی سے صرف سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اس سے نہ انسان کا ایمان خطرے میں پڑتا ہے اور نہ ہی مجرم خدا کے غضب کا مستحق قرار پاتا ہے۔ لیکن یہاں یہ کیفیت ہے کہ قوانین تو انسانوں کے وضع کردہ ہی نافذ کئے جاتے ہیں، لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ ان کی خلاف ورزی سے نہ صرف سزا ہی ملتی ہے، بلکہ انسان کا ایمان بھی خطرے میں پڑ جاتا ہے اور اس پر خدا کا غضب بھی وارد ہوتا ہے۔

متضاد قوانینِ خداوندی:

اسے کہتے ہیں تھیاکریسی جو انسانی غلامی کی شدید ترین اور بدترین شکل ہے اور جسے ختم کرنے کے لئے اقبالؒ اور

قائداعظمؒ نے مملکتِ پاکستان کو حاصل کیا تھا۔ انہوں نے بتکرار کہا تھا کہ اور کچھ ہو یا نہ ہو، پاکستان میں تھیاکریسی کو رائج نہیں ہونے دیا جائے گا جس میں مذہبی پیشوا اپنے قوانین کو قوانینِ خداوندی کہہ کر منواتے ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور نکتہ بھی قابلِ غور ہے۔ پاکستان میں فقہ حنفی کے ماننے والوں کی اکثریت ہے، اس لئے یہاں وہ فقہ خدا کا قانون ہے۔ ایران میں فقہ جعفریہ کے ماننے والوں کی اکثریت ہے اس لئے وہاں وہ فقہ خدا کا قانون ہے۔ یعنی مسلمانوں کی دو آزاد مملکتوں میں دو ضوابطِ قوانین نافذ ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ لیکن (مودودی صاحب کے ارشاد کے مطابق) دونوں ''قانونِ خداوندی'' ہیں۔ سعودی عرب میں حنبلی فقہ (اسی اصول کے مطابق) خدا کا قانون ہے جو ان دونوں سے مختلف ہے۔ کل کو اگر مصر، مراکش، انڈونیشیا وغیرہ نے بھی اپنے ہاں فقہی قوانین نافذ کر لئے تو مالکی اور شافعی فقہیں بھی خدا کا قانون قرار پا جائیں گی جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہ ہے وہ اسلام جسے دنیا میں رائج کرنے کی کوشش کی جارہی ہے!

پاکستان میں شیعہ حضرات فقہ جعفری کے نفاذ کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ اگر ان کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تو یہاں دو متوازی حکومتیں قائم ہو جائیں گی جن کا اپنا اپنا ضابطۂ قوانین ہوگا اور یہ دونوں ''خدا کے قوانین'' کہلائیں گے۔ اگر ان کا یہ مطالبہ منظور نہ کیا گیا تو ظاہر ہے کہ شیعہ حضرات فقہ حنفی کی خلاف ورزی کریں گے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ وہ قانون کے مطابق سزا کے مستوجب ہوں گے بلکہ (مودودی صاحب کے فیصلہ کی رو سے) ان کا ایمان بھی خطرے میں پڑ جائے گا اور وہ موردِ غضبِ خداوندی بھی ہوں گے۔ اور اگر شیعوں نے اکثریت حاصل کر لی تو پھر حنفیوں کا ایمان خطرہ میں پڑ جائے گا اور یہ مغضوب علیہ ہو جائیں گے۔ اس سے آپ یہ بھی دیکھئے کہ اس طرح خدا کا کس قسم کا تصور سامنے آتا ہے؟ یہ تصور کہ اس کی خوشنودی یا غضب کا کوئی مستقل معیار نہیں۔ یہ، لوگوں کی کثرت اور قلت پر منحصر ہے۔ آج ایک گروہ کو اکثریت حاصل ہے تو وہ منعم علیہ ہے۔ کل کو وہ اقلیت میں آ گیا تو اس پر خدا کا غضب وارد ہو گیا! اس سے خدا کا تصور (معاذ اللہ، صد بار معاذ اللہ) پارلیمان کے سپیکر کا سامنے آتا ہے جسے ہر اکثریت کو برحق قرار دینا پڑتا ہے۔ آج یہ اکثریت میں، کل وہ اکثریت میں۔ آج یہ حق پر کل وہ حق پر!

آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہاں مذہب کے نقاب میں کیا کھیل کھیلا جا رہا ہے؟ ہمارے نزدیک یہ کوئی اتفاقی حادثہ نہیں۔ یہ ایک سوچی سمجھی، پہلے سے طے شدہ اسکیم کا نتیجہ نظر آتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ دُنیا کی کوئی مملکت ___ خواہ وہ برطانیہ، امریکہ اور بھارت کی نظامِ سرمایہ داری کی حامل ہو اور خواہ روس اور چین کی کمیونزم یا سوشلزم کی علمبردار۔ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتی کہ مسلمانوں کی کسی مملکت میں قرآنی نظام رائج ہو جائے۔ اس سے ان کے نظام تباہ ہو جاتے ہیں۔ مطالبۂ پاکستان کے زمانے میں اس کا بار بار اعلان کیا گیا تھا کہ ہم ایک آزاد مملکت کا قیام اس لئے چاہتے ہیں کہ اس میں قرآنی نظام رائج کیا جائے۔ یہ تمام مملکتیں اس سے لرزہ براندام تھیں اور اسی بناء پر وہ تقسیم ہند کی مخالفت کرتی تھیں۔ لارڈ کرد مرنے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ:

> اگر مسلمان ممالک آزاد ہونا چاہئیں تو ہم ان کو آزاد کر دیں گے۔ لیکن اگر وہ اپنی اسلامی حکومت قائم کرنا چاہیں تو ہم ہرگز یہ برداشت نہیں کریں گے۔ (ہفتہ وار ایشیاء، مورخہ 18 جولائی 1976ء)

تحریکِ پاکستان کے دوران ہندوؤں کے مشہور رہنما مسٹر منشی نے برملا کہا تھا کہ:

تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سُن لیجئے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لئے ایسے مسکن بنالیں جہاں طرزِ حکومت قرآنی اصولوں کے سانچے میں ڈھل سکے۔ (ٹریبیون، مورخہ 2 نومبر 1941ء)

اور تو اور مسٹر گاندھی تک یہ کہہ رہے تھے کہ:

اگر مذہب کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے۔ یعنی ایک نج کا معاملہ اور خدا اور بندے کے درمیان ایک ذاتی تعلق تو پھر ہندوؤں اور مسلمانوں کے کئی ایک اہم مشترک عناصر نکل آئیں گے جو مجبور کریں گے کہ یہ دونوں ایک مشترکہ زندگی بسر کریں اور ان کی راہِ عمل بھی مشترک ہو۔ (ہندوستان ٹائمز، مورخہ 9 جون 1940ء)

قائداعظمؒ کی وفات پر ہندوؤں نے اندازہ لگایا تھا کہ اب پاکستان کی پوزیشن کمزور ہوگئی ہے اس لئے اس سے سمجھوتے کی شکل پیدا ہوسکتی ہے۔ اس سمجھوتے کے متعلق روزنامہ ہندوستان ٹائمز نے اپنی 19 اکتوبر 1948ء کی اشاعت کے مقالۂ افتتاحیہ میں لکھا تھا کہ:

اگر پاکستان اسلامی اسٹیٹ کے خیال کو ترک کردے اور اپنے سامنے ایک جمہوری ریاست کی تشکیل کا نصب العین رکھے تو اس سے پاکستان اور ہندوستان اور ہندوؤں اور مسلمانوں میں خوشگوار تعلقات کا ایک نیا دور شروع ہوجائے گا۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ یہ مملکتیں اسے برداشت ہی نہیں کرسکتی تھیں کہ پاکستان قرآنی مملکت بن جائے۔ جو جماعتیں مذہب کے نام پر تشکیلِ پاکستان کی مخالفت کررہی تھیں وہ گزشتہ تیس سال سے پاکستان کے اندر رہتے ہوئے اس جدوجہد میں مصروف چلی آرہی ہیں کہ یہ مملکت قرآنی نہ بننے پائے۔ تشکیلِ پاکستان کے بعد، جس تیزی، شدت، کثرت اور وسعت سے ''غیر اسلامی اسلام'' اولین اس ملک اور ثانیاً دیگر ممالک میں پھیلایا گیا ہے، اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ کیا آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ اس کے بالآخر ذرائع کیا ہیں؟ اب ان کی یہ کوششیں بارآور ہورہی ہیں اور انہوں نے یہاں تھیاکریسی کو مسلط کرنا شروع کردیا ہے۔ یاد رکھئے! سیکولرازم کے مقابلہ میں اسلامی نظام کا قیام اتنا مشکل نہیں ہوتا جتنا تھیاکریسی کے نظام میں مشکل ہوتا ہے۔ سیکولرازم میں خدا کا انکار ہوتا ہے اس لئے مسلمان اسے ٹھنڈے پیٹوں قبول نہیں کرتے۔ تھیاکریسی میں اسی سیکولرازم کو خدا کا نام دے کر مسلط کیا جاتا ہے اس لئے عوام بہت جلد اس فریب میں آجاتے ہیں اور پھر اس جال سے چھٹکارا مشکل ہوجاتا ہے۔

یہ ہے وہ مقام جہاں ہم آج کھڑے ہیں۔ ہماری بدنصیبی کی مثال تاریخ میں شاید ہی کہیں مل سکے۔ ہم نے یہ مملکت حاصل کی تھی کہ ہم انسانوں کی غلامی سے نجات پاکر، اور ایک خدا کی چوکھٹ پر سر جھکا کر ساری دنیا کے آستانوں سے سرفرازانہ آگے بڑھ

جائیں۔لیکن ہوا یہ کہ ہم انسانی غلامی کی اُن زنجیروں میں جکڑے گئے جن سے زیادہ محکم گرفت کسی زنجیر کی نہیں ہوسکتی۔

خواستم پیکاں برآرم، در جگر نشتر شکست

میں جانتا ہوں کہ یہاں مسلسل سازشوں سے ایسے حالات پیدا کردئے گئے ہیں کہ قرآنِ کریم کی آواز کسی کان تک پہنچنے نہ پائے۔ میں اس کے باوجود یہ آواز بلند کئے جارہا ہوں مقصد اس سے یہ ہے کہ کم ازکم آنے والا مؤرخ اس حقیقت کو اپنے سامنے بے نقاب پائے کہ ان تمام شورشوں اور سازشوں کے باوجود ایک گوشہ ایسا بھی تھا جہاں سے یہ آواز مسلسل اور متواتر بلند ہورہی تھی کہ:

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ (3:79)

کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں__ خواہ وہ مقنن ہو، خواہ حکمران، حتیٰ کہ وہ منصبِ نبوت پر بھی سرفراز کیوں نہ ہو__ کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میرے محکوم اور غلام بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تم اس کتابِ خداوندی کی اطاعت سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور اپنی فکر کا مرکز بناتے ہو فقط اللہ کے محکوم بن جاؤ۔

اس کا نام حقیقی آزادی ہے۔ جس سے ہم محروم ہی نہیں، پہلے سے بھی کوسوں دور ہیں۔

ٹپک اے شمع! آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری

کیا کیا جائے؟

آخر میں سوال یہ ہے کہ ان حالات میں کیا کیا جائے۔ میں اس سوال کے جواب کو کسی خاص خطۂ سرزمین تک محدود نہیں رکھنا چاہتا اس لئے کہ جو کچھ میں نے اوپر عرض کیا ہے وہ پاکستان تک محدود نہیں۔ اس وقت مسلمانوں کے تمام ممالک میں صورت حالات کم وبیش یہی ہے۔ اس لئے میں اپنے جواب میں یہ کہوں گا کہ جو مملکت بھی یہ چاہتی ہے کہ وہ ایک خدا کی محکومی اختیار کرکے، انسانوں کی ہر قسم کی محکومیت سے آزادی حاصل کرے۔ خواہ اس محکومیت کی شکل ملوکیت ہو یا آمریت، تھیاکریسی ہو یا عصرِ حاضر کا جمہوری نظام۔ اسے کرنا یہ ہوگا کہ:

1۔ اپنے آئین میں اعلان کرے کہ مملکت میں اقتدارِ اعلیٰ قرآنِ مجید کو حاصل ہوگا۔

2۔ مملکت کا فریضہ قرآنی احکام وقوانین، اصول واقدار کو عملاً نافذ کرنا ہوگا۔

3۔ یہ بات امت (مملکت کے مسلمان باشندوں) کے باہمی مشوروں سے طے کی جائے گی کہ ان اصول وقوانین کو بحالات موجودہ نافذ کرنے کا طریق کار کیا ہوگا۔ اس مشاورت کی مشینری خود تجویز کی جائے گی۔ اس مجلسِ مشاورت کو آپ

پارلیمان کہہ لیجئے۔ پارلیمان میں کوئی پارٹی نہیں ہوگی کہ قرآنِ کریم کی رو سے مذہبی فرقہ سازی یا پارٹی بازی شرک ہے۔ پارلیمان کی رکنیت کے لئے بنیادی شرط، قرآنی احکام واقدار سے واقفیت ہوگی۔

4۔ یہ سوال پیدا ہوتا رہے گا کہ اگر پارلیمان میں اس بات پر اختلاف ہوجائے کہ جو کچھ طے کیا جارہا ہے وہ قرآنی تعلیم کے مطابق ہے یا نہیں، یا عام افرادِ معاشرہ میں یہ خیال پیدا ہو کہ پارلیمان جو فیصلہ کررہی ہے وہ قرآن کے مطابق نہیں تو ایسی صورت میں کیا کیا جائے؟ میرے نزدیک اس کا حل یہ ہے کہ ملک کی عدالتِ عالیہ کے ارکان، ممتاز قانون دان حضرات اور قرآنِ کریم پر گہری نگاہ رکھنے والے اربابِ علم وبصیرت پر مشتمل ایک مجلس قائم کی جائے جس کے سامنے اختلافی امور پیش ہوں۔ اس مجلس کے اراکین اس شرط سے مشروط ہوں کہ وہ کسی خاص مسلک کو نہیں بلکہ قرآن مجید کو آخری سند وحجت تسلیم کرتے ہیں۔ وہ یہ طے کریں کہ قرآنِ کریم کے حکم کو عملاً نافذ کرنے کے لئے جو طریقِ کار تجویز کیا جارہا ہے وہ ممکن العمل ہے اور قرآن کے کسی اصول سے ٹکراتا نہیں۔

راستے کی خطرناک گھاٹیاں

راستے کی خطرناک گھاٹیوں سے آگاہ کرتے ہوئے مفکرِ قرآن نے کہا: لیکن عزیزانِ من! اس سفر میں ایک گھاٹی ایسی بھی آتی ہے۔ جہاں کوئی باہر کا رہزن، ڈاکہ زنی نہیں کرتا۔ خود اپنے اندر کا چور کمین میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ یہ گھاٹی ایسی ہے جہاں سے پاؤں پھسلے تو انسان سیدھا جہنم کے عمیق غاروں میں جا گرتا ہے اور وہ گھاٹی یہ ہے کہ آپ اس سلسلہ میں جو کچھ کریں اس میں کسی دنیاوی اجر ومعاوضہ کا خیال تو ایک طرف، نمود ونمائش کا شائبہ تک بھی نہ آنے پائے، کہ یہ وہ شرک کی چنگاری ہے جو سب متاعِ عمل کو جلا کر خاکستر بنا دیتی ہے۔ قرآنِ کریم نے اس عظیم حقیقت کو بڑے بصیرت افروز انداز سے بیان کیا ہے جب کہا ہے کہ اِنۡ اَحۡسَنۡتُمۡ اَحۡسَنۡتُمۡ لِاَنۡفُسِکُمۡ ۟ (17:7) تم کوئی اچھا کام کرتے ہو تو وہ کسی دوسرے کے لئے نہیں، بلکہ خود تمہاری بھلائی کے لئے ہوتا ہے۔ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَیۡرٍ فَلِاَنۡفُسِکُمۡ ؕ (2:272)۔ جو کچھ تم بظاہر دوسروں کو دیتے ہو وہ درحقیقت خود اپنے آپ کو دیتے ہو۔ اب آپ سوچئے کہ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ تم ایک مکان اپنے لئے بناؤ اور اس کا احسان اہل مکہ کے سر دھرو۔ تم کھانا خود کھاؤ اور اس کے شکریہ کے متمنی اپنے دوست سے ہو۔ یہی کیفیت اس ___ کام کی ہے جسے آپ قرآنی تحریک کے لئے کرتے ہیں۔ خواہ وہ مالی خدمت ہو یا صرف محنت، یا ایثارِ وقت۔ اگر آپ یہ سمجھ لیں کہ یہ سب کچھ آپ اپنے لیے کرتے ہیں تو پھر آپ کے دل میں کسی اجر ومعاوضہ کی تمنا یا صلہ وستائش کی آرزو پیدا نہیں ہوگی۔ لیکن اگر اس سے آپ کے دل میں اس قسم کا کوئی جذبہ بیدار ہوتا ہے تو سمجھ لیجئے کہ وہ ابلیس کا افسوں ہے جس سے وہ آپ کے اعمال کو رائیگاں بنا رہا ہے۔ انسان تو ایک طرف، قرآنی ذہنیت تو اپنے خدا سے بھی یہ کہتی ہے کہ ؎

شانِ عطا کو تیری عطا کی خبر نہ ہو
یوں بھیک دے کہ دستِ گدا کو خبر نہ ہو!

(پرویزؒ، سالانہ کنونشن، 9 تا 12 نومبر 1967ء)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بچوں کا صفحہ

السلام علیکم

نعیم کو آج بہت زوروں کی بھوک لگ رہی تھی۔ سکول سے واپسی پر گھر میں داخل ہوتے ہی اس کے منہ سے نکلا:

''امی! مجھے بڑی سخت بھوک لگی ہے۔ جلدی سے کھانا دے دیں۔''

امی بولیں: ''آؤ بیٹا! کھانا تو تیار ہے لیکن کیا آج تمہیں اتنی بھوک لگی ہے کہ تم سلام کرنا بھی بھول گئے۔''

''اوہ امی! معاف کر دیں۔ میں سچ مچ بھول ہی گیا۔'' نعیم نے شرمندگی سے کہا۔

''چلو کوئی بات نہیں۔ انسان سے بھول تو ہو ہی جاتی ہے مگر کوشش یہ ہونی چاہئے کہ ایک دفعہ کی بھول کو بار بار نہ دہرایا جائے۔'' امی نے نعیم کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنی بات جاری رکھی ''تم کھانا کھا لو پھر میں تمہیں اس سلام کے متعلق چند ایسی باتیں بتاؤں گی جو تم ابھی نہیں جانتے مگر ان کا جاننا تمہارے لیے ضروری ہے۔ تمہاری بہن سمیعہ بھی سکول سے آجائے تو پھر دونوں غور سے سننا۔''

اتنے میں سمیعہ بھی خوش خوش اپنا بستہ اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔

''السلام علیکم امی جان۔ السلام علیکم بھائی جان!'' سمیعہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

امی اور نعیم نے وعلیکم السلام کہتے ہوئے اسے پیار کیا اور تینوں کھانا کھانے لگ گئے۔ کھانا کھا کر دونوں بچے سلیقے سے اپنی امی کے پاس بیٹھ گئے اور سلام کا مطلب پوچھا۔

امی کہنے لگیں: ''اچھا نعیم بیٹے! پہلے تم بتاؤ کہ السلام علیکم کے کیا معنی ہیں؟''

''جی امی! اس کے معنی ہیں کہ آپ پر سلامتی ہو۔'' نعیم نے جواب دیا۔

''ٹھیک کہا تم نے۔ میں نے تمہیں اس کے یہی معنی بتائے تھے۔ اور سمیعہ! اب تم یہ بتاؤ کہ اس کے جواب میں علیکم السلام کیوں کہتے ہیں؟''

''اس لئے امی! کہ اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ آپ پر بھی سلامتی ہو۔''

''درست بیٹی۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تم دونوں نے اس لفظ کے معنی یاد رکھے ہوئے ہیں۔ اب میں تمہیں یہ بتانا

چاہتی ہوں کہ السلام علیکم کہنے کا اصل مقصد کیا ہے اور اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں آپس میں السلام علیکم کہنے کا حکم کیوں دیا ہے؟ ذرا غور سے سنو۔''

دونوں بچے توجہ سے سننے لگے تو ان کی امی نے کہا:

''بچو! یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ جب دو آدمی آپس میں ملتے ہیں تو باتیں شروع کرنے سے پہلے ایک دوسرے کو سلام دعا دیتے ہیں۔ ہم مسلمان ایک دوسرے کو السلام علیکم کہتے ہیں کیونکہ قرآن مجید میں یہی لفظ آیا ہے۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ آپس میں بات کرنے سے پہلے ایک دوسرے کو سلامتی کی دعا دے کر دونوں کے دل ایک دوسرے کے اتنے قریب ہو جائیں کہ ہر بات محبت سے کی جا سکے۔ السلام علیکم کہنے والے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ (میری آرزو ہے) آپ ہر طرح خیریت اور سلامتی سے رہیں۔ اگر اس کے لئے کسی وقت میری مدد کی ضرورت ہو تو میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ اس کے بعد جواب دینے والا بھی یہی الفاظ دہراتا ہے اور اس طرح دونوں ایک دوسرے کے دوست بن کر بات شروع کرتے ہیں۔''

کوئی دعویٰ نہیں

کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں نے قرآن کریم کو اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی فکر پر اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے میری یہ فکر میری تحریروں میں محفوظ ہے اور انہی تحریروں کا میں ذمہ دار ہوں۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی بات میری طرف منسوب کرے جو میری تحریروں میں نہیں، تو اس بات کو نہ کوئی سند حاصل ہو سکتی ہے نہ میں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جا سکتا ہوں، خواہ وہ شخص مجھ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ میں نے اس وارننگ کو اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سلسلہ ابھی سے شروع ہو گیا ہے۔ اس زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو باتیں تو اپنی طرف سے کرتے ہیں، اور منسوب کر دیتے ہیں انہیں تحریکِ طلوعِ اسلام کی طرف، وہ دانستہ ایسا کرتے ہوں یا نادانستہ، دونوں صورتوں میں اس سے تحریک کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ تحریک کے لیے سند صرف وہ تحریریں ہیں جو اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، نہ کہ زبانی روایات خواہ راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں میری درخواست ہے کہ آپ احباب اس کا بھی خاص طور پر خیال رکھیں۔

(پرویزؒ، سالانہ کنونشن، 17 تا 20 مارچ 1966ء)

محمد علی صابر صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نوجوانوں کا صفحہ

نخلِ سینا

نشست نمبر 1

صبح کا وقت ہے اور سردی کا موسم چھڑا چھڑ بارش کی جلترنگ بج رہی ہے۔ کلیم الزمان زبیری حسب معمول اپنی نماز اور درود و وضائف کے بعد ڈائننگ روم میں کمبل اوڑھے ناشتے کا انتظار کر رہے ہیں۔ بیگم حلیمہ کلیم ناشتے کا سامان اٹھا کر کمرے میں داخل ہوتی ہیں اور ساتھ ہی کلیم صاحب کا چھوٹا بیٹا شکیل الزمان چھینکتے ہوئے کمرے میں داخل ہوتا ہے۔ اپنی برساتی ایک کھونٹی پر ٹانگ کر کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ اپنے والد کی استفہامیہ نگاہوں کا جواب دیتے ہوئے کہتا ہے۔

شکیل الزمان (بیٹا): ابو! اوپر کتے اور بلیاں لڑ رہے ہیں۔ گھمسان کا رن پڑا ہوا ہے، برساتی کے باوجود بھیگ گیا ہوں کپڑے بدل کر آتا ہوں۔

کتے بلیوں کی جنگ کا سن کر حلیمہ بول اٹھتی ہیں کہ اس بارش میں کتے بلیاں نگوڑی کہاں سے آ گئیں جس پر کلیم الزمان مسکراتے ہوئے بیگم سے کہتے ہیں۔ حلیمہ بیگم صاحبہ! آپ سے سو بار کہا ہے کہ تھوڑی سی انگریزی سیکھ لیں کام آئے گی۔ آپ تو جانتی ہیں کہ شکیل کا طرز گفتگو کیا ہے۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ اُسے انگریزی میں کہتے ہیں، ''Its raining cats & dogs'' کلیم الزمان پھر شکیل کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہتے ہیں کہ تم جانتے ہو کہ موسم سرما شروع ہو گیا ہے۔ اس کے باوجود تم احتیاط نہیں برت رہے۔ آخر بارش میں چھت پر جانے کی کیا ضرورت تھی۔ الماری میں "ڈکامارا" رکھی ہے چند گولیاں منہ میں ڈال لو۔

شکیل الزمان (بیٹا): ابو! میرا بیٹ چھت پر رہ گیا تھا۔ زیادہ بارش کی وجہ سے وہ بہہ کر پرنالے میں جا اٹکا جس کی وجہ سے پرنالہ بند ہو گیا اور چھت تالاب بنتی جا رہی تھی۔ پرنالہ کھولنا ضروری تھا۔

کلیم الزمان (سربراہ): پرنالہ کھولنا ضروری تھا، بہت اچھا کیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری کرکٹ نے تو پوری قوم کا پرنالہ بند کر رکھا ہے۔ میچ فکسنگ کی وجہ سے کئی کھلاڑیوں کو برطانیہ میں جیل جانا پڑا۔ پوری دنیا میں پاکستان کی جگ ہنسائی ہوئی۔ پھر کھلاڑیوں پر طرح طرح کے الزام لگ رہے ہیں، کہیں وہ نائٹ کلبوں میں ڈانس کر رہے ہیں، کہیں حسیناؤں کو بغل میں دبائے دیکھے گئے ہیں۔

شکیل الزمان کلیم صاحب کا چھوٹا بیٹا اور لاڈلا ہونے کی وجہ سے وہ اپنے والد سے کبھی بھی الجھ بھی پڑتا ہے چنانچہ اس نے کرکٹ اور کرکٹ کے کھلاڑیوں کا دفاع کرتے ہوئے ان کی تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر دیئے کہ ہمارے کھلاڑی چھکے مار مار کر ملک وقوم کا نام روشن کر رہے ہیں۔ کلیم صاحب جہاندیدہ انسان ہیں لہذا انہوں نے شکیل کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے ایک تاریخی جملہ کہہ دیا۔ انہوں نے کہا کہ بیٹے سنو! جس قوم میں گفتار و کردار کی ہمہمی اور کارگزاری کی گہما گہمی، ڈائریکٹریٹ آف ایجوکیشن سے شفٹ ہو کر ڈائریکٹریٹ آف کرکٹ بورڈ میں چلی جائے تو اس قوم کے مستقبل کا خدا ہی حافظ ہو سکتا ہے۔

باپ بیٹے میں یہ بحث ہو رہی تھی کہ کلیم صاحب کے بڑے بیٹے عقیل الزمان ڈائننگ روم میں داخل ہوئے۔ عقیل الزمان نے اپنے والد کی طرح وکالت کا پیشہ اختیار کیا تھا اور اس کے لباس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کورٹ میں جانے کے لئے پوری طرح تیار ہو کر آیا ہے لیکن ان کی بیگم عالم آرا معمولی لباس پہنے تھی۔ عالم آرا نے اسلامیات میں ایم اے کر رکھا تھا اور وہ کسی سکول میں پڑھاتی ہیں۔

جب عقیل اور عالم آرا اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے تو کلیم صاحب نے عالم آرا کی ہیئت کذائی دیکھ کر کہا۔

کلیم الزمان (سربراہ): بیٹی عالم آرا! اگر میں تمہیں کوئی بات کہوں تو برا تو نہیں مانو گی؟

عالم آرا (بہو): نہیں ابو آپ کہیں۔ برا ماننے کی کیا بات ہے۔

کلیم الزمان: میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ تمہارا نام عالم آرا ہے۔ تم خود آرائی نہیں کر سکتیں۔ عالم آرائی کیا کرو گی۔ اپنی حالت دیکھو اور اپنے کمرے کی حالت دیکھو۔

کلیم صاحب اور عالم آرا کی باتیں سن کر شکیل الزمان بول اٹھا۔ ''یہ اڑی اڑی سی رنگت یہ کھلے کھلے سے گیسو۔ یہ سن کر کلیم صاحب نے بڑے غصہ میں کہا۔ شکیل آگے کچھ نہ کہنا ورنہ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اس پر شکیل نے کہا۔ ابو! یہ میری بھابی ہیں۔ میں ان سے مذاق کرنا اپنا حق سمجھتا ہوں۔

کلیم الزمان (سربراہ): شکیل ایک بات یاد رکھو اور آئندہ بھی یاد رکھنا کہ مذاق کی بھی کچھ حدود ہوتی ہیں۔

اپنے والد کو غصے میں دیکھ کر عقیل نے کہا کہ ابو میں نے سو دفعہ ان سے کہا ہے کہ صبح صبح اس پر عقیل کی بات کاٹتے ہوئے کلیم صاحب نے کہا کہ عقیل! چپ رہو۔ ہم اپنی بیٹی سے بات کر رہے ہیں۔ اس پر عالم آرا نے کہا کہ دراصل بات یہ ہے کہ میں انتظار کر رہی تھی کہ شبو آ جائے تو اس سے کمرہ صاف کروالوں۔ مجھے بھی ساتھ کچھ کام کرنا پڑے گا، میرا ارادہ ہے کہ کچھ اڑوس پڑوس کی بچیوں کو بلا کر ختم قرآن کا بندوبست کروں۔

کلیم الزمان (سربراہ): اچھا خیال ہے مگر مجھے ختم قرآن کی اصطلاح سے اتفاق نہیں۔ معلوم نہیں کس ستم ظریف نے یہ اصطلاح گھڑی ہے کہ ختم قرآن کر کے قرآن مجید کے احکام کو بالکل ختم ہی کر دیا گیا ہے۔

عالم آرا (بہو): ابو! وہ کیسے؟

کلیم الزمان (سربراہ): یہ ایک لمبا موضوع ہے۔ اس پر کسی اور وقت گفتگو کریں گے فی الحال میں تمہیں ایک نصیحت کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ کہ تم شبانہ بی بی کو شبو کہہ کر نہ بلایا کرو۔ اسے ہمیشہ اس کے پورے نام سے مخاطب ہوا کرو۔ یہ مقسوم کا پہیہ بھی عجیب ہے کبھی ادھر گھومتا ہے اور کبھی ادھر۔ مغلوں نے ہندوستان میں کئی سو سال حکومت کی، اسوقت مغل اور مغلانی بڑے باعزت الفاظ تھے لیکن پھر گردش فلک نے دیکھا کہ گھر کی نوکرانی کو مغلانی کہا جانے لگا۔ ہمیں معلوم ہے کہ شبانہ بی بی کے دل و دماغ پر نوکرانی ہونے کی وجہ سے کس قسم کے خیالات اور جذبات کا پہرہ ہوگا ہوسکتا ہے کہ اس نے کبھی اچھے دن دیکھے ہوں اور اب نوکری کرنے پر مجبور ہوگئی ہو۔ تمہارے ختم قرآن کے متعلق تو کسی اور وقت گفتگو ہوگی فی الحال میں یہی کہنا چاہتا ہوں کہ عالم آرائی سے خود آرائی پہلے ہونی چاہیے۔

عالم آرا (بہو): ابو! آپ نے ختم قرآن کو اصطلاح کہہ کر مجھے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔

کلیم الزمان (سربراہ): بیٹی! اگر میں نے ختم قرآن پر گفتگو شروع کر دی تو بات بہت لمبی ہو جائے گی۔ ہم تو ختم قرآن اسی وقت کرتے یا کراتے ہیں جب کسی کے ہاں اولاد نرینہ کی خواہش ہو، یا کوئی وفات ہو جائے، یا کسی مصیبت سے چھٹکارا مقصود ہو، یا خدا تعالیٰ سے کچھ حاصل کرنا ہو، یہاں ایک لطیفہ کی بات یاد آ گئی جو ہمارے ایک دوست نے سنایا تھا۔ پاکستان فضائیہ کے ایک سٹیشن کمانڈر صاحب نے ختم قرآن کا حکم دیا۔ شائد ان کی پروموشن کا معاملہ اٹکا ہوا تھا۔ ایسے کاموں کے لئے افواج میں ایجوکیشن افسر کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔ بات چلتے چلتے وارنٹ آفیسر پر آٹھہری جو اپنا فالتو وقت زیادہ تر مسجد میں گزارتے تھے۔ ان کو حکم دیا گیا کہ ختم قرآن کا بندوبست کرو۔ محفل میں اوسی ایڈمن ونگ موجود تھے۔ وارنٹ آفیسر نے ان سے کہا کہ مٹھائی کے لئے کچھ رقم Recommend کر دیں۔ اس پر اوسی ایڈمن صاحب نے نہایت ترش لہجہ میں فرمایا کہ مٹھائی کی کیا ضرورت ہے کیا مٹھائی کے بغیر ختم قرآن نہیں ہوسکتا؟ صحابہ کے زمانے میں کونسی مٹھائی بٹا کرتی تھی؟ وارنٹ آفیسر نرم مزاج اور ہنس مکھ قسم کے آدمی تھے، ویسے بھی جونیئرز کو افسر صاحبان کے سامنے نگاہیں نیچی ہی رکھنی پڑتی ہیں اور خاص کر افواج میں وارنٹ آفیسر نے نہایت نرم لہجے میں عرض کرتے ہوئے کہا، سر! صحابہ کے زمانے میں ختم قرآن ہوا ہی نہیں کرتا تھا۔ اوسی صاحب یہ کہتے ہوئے چلے گئے اچھا اچھا پی ایس آئی فنڈ سے ایک سو روپیہ جا کر لے لو۔ بیٹی یہ ہے ختم قرآن کی پوزیشن۔ قرآن مجید کے ایک ایک لفظ میں حیات بخش تصورات کی ایک دنیا چھپی ہوئی ہے۔ اس وقت مجھے شکیل صاحب سے کچھ کہنا ہے۔ قرآن مجید پر تم سے پھر کسی وقت بات ہوگی۔ تم جاؤ اپنا کام کرو۔ اس کے بعد کلیم الزمان شکیل کی طرف متوجہ ہوئے۔ اچھا تو بیٹے یہ بتاؤ کہ کرکٹ کھیلنے والے اپنے ملک کا نام دنیا بھر میں روشن کر رہے ہیں۔ اور میڈیا بھی ان کی بڑی تعریف کر رہا ہے۔ ہماری جوانی کے زمانے میں لوگ اکثر ایکٹروں اور ایکٹرسوں کو فلم سٹار کہا کرتے تھے۔ آجکل یہ کرکٹ سٹار پیدا ہو گئے ہیں۔

میری نظر میں یہ سٹار نہیں شوٹنگ سٹار ہیں، جو تھوڑی دیر چمک غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ کیا تم جانتے ہو کہ مولانا محمد علی جوہر کے بھائی مولانا شوکت علی اپنے زمانے کے مشہور کرکٹ پلیئر تھے۔ کیا تم نے کبھی ڈاکٹر دلاور کا نام سنا ہے کبھی ڈاکٹر جہانگیر کا نام سنا ہے یہ سب اپنے زمانے کے مشہور کھلاڑی تھے اور فضل محمود نے اپنی باؤلنگ سے انگریزی لغت میں ایک لفظ کا اضافہ کر دیا۔ جب اخباروں نے لکھا کہ برطانوی کرکٹ ٹیم فضلڈ آؤٹ ہو گئی لیکن ان سب مشاہیر کو آج بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ آج جو بڑے کھلاڑی تمہیں نظر آ رہے ہیں کچھ عرصہ بعد ان کا بھی وہی حال ہوگا۔ وہ بھی ماضی کے پردے میں غائب ہو جائیں گے۔

شکیل الزمان (بیٹا): ابو! آخر آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔ کیا آپ سپورٹس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے؟

کلیم الزمان (سربراہ): ہرگز نہیں۔ بلکہ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ کھلاڑی فٹ بالر ہو یا ہاکی پلیئر، ٹینس پلیئر ہو یا کرکٹ پلیئر جب وہ گیم ختم کر کے نہا دھو کر چائے کا ایک پیالہ پیتا ہے تو اس سے زیادہ فرحت بخش لمحہ اور کوئی نہیں ہوتا۔ لیکن یہ فرحت بخش لمحہ اسی وقت میسر ہوتا ہے جب کھیل کو کھیل کے طور پر کھیلا جائے۔ کھیل کو اگر شہرت حاصل کرنے کیلئے کھیلا جائے تو ناکامی کی صورت میں طبیعت میں اضمحلال آ جاتا ہے اور اگر پیسوں کے لئے کھیلا جائے تو طبیعت میں سفلہ پن پیدا ہو جاتا ہے اور لوگ بین الاقوامی شہرت رکھتے ہوئے بھی لالچ کی وجہ سے بجلی چرانے سے باز نہیں رہتے اور ان کی حیثیت رومن زمانہ کے گلیڈی ایٹرز سے زیادہ نہیں رہتی۔

کلیم الزمان (سربراہ): بیٹا! تمہیں بین الاقوامی شہرت مل بھی گئی تو کیا حاصل؟ ایسی شہرت چند سال سے زیادہ قائم نہیں رہتی۔ بعض اوقات سینہ پر شہرت کے تمغے سجانے والوں کو پیٹ پوجا کے لئے گنڈیریاں بیچنا پڑتی ہیں۔ میرے بچپن کے زمانہ میں ہندوستان میں ہی نہیں دنیا بھر میں فٹ بال ٹیم بنگال محمڈنز کا بہت شہرہ تھا لیکن بڑھاپے میں ان کھلاڑیوں کا کیا حشر ہوا وہ کوئی نہیں جانتا۔ سب مٹی کے ڈھیر تلے دبے پڑے ہیں۔

شکیل الزمان (بیٹا): ابو! عمران خان کے متعلق آپ کیا کہیں گے؟

کلیم الزمان (سربراہ): بیٹا! عمران خان تاریخ میں کرکٹ کی وجہ سے نہیں اپنی انسان دوست فطرت کی وجہ سے زندہ رہے گا۔ لوگ اسے کینسر ہاسپٹل کی وجہ سے اور اسکی تعلیمی سرگرمیوں کی وجہ سے تاریخ کے دامن میں زندہ رکھیں گے۔ اسی طرح ابرار الحق بلو کے گھر کی وجہ سے نہیں بلکہ اس ہاسپٹل کی وجہ سے تاریخ میں ہمیشہ زندہ رہے گا جو اس نے غریب عوام کیلئے بنایا ہے اور عبدالستار ایدھی نے تو کبھی کرکٹ نہیں کھیلی لیکن پھر بھی دنیا بھر میں ایک سربرآوردہ انسان کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ تم دیکھتے ہو کہ قوم جہالت اور افلاس کے سمندر میں غرق ہے اور ہمارے ہاں دو درجن بلہ بازوں نے پوری قوم کو الو بنا رکھا ہے۔ یہی ہے مرنے والی امتوں کا عالم پیری۔ میں تمہیں تاریخ سے ایک مثال دیتا ہوں تم نے کبھی سپارٹا کا نام سنا ہے؟

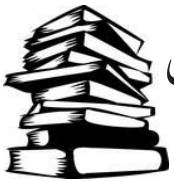
شکیل الزمان (بیٹا): کوئی ایکٹر ویکٹر ہوگا۔ یا کوئی کھلاڑی۔

کلیم الزمان (سربراہ): سنو بیٹا! سپارٹا ایک ریاست کا نام تھا۔ وہ علاقہ جسے اب یونان کہا جاتا ہے۔ وہاں کسی زمانہ میں چھوٹی چھوٹی شہری ریاستیں ہوا کرتی تھیں۔ ان میں ایتھنز اور سپارٹا زیادہ مشہور تھیں اور دونوں ریاستوں میں ہمیشہ چپقلش رہتی تھی۔ سپارٹا کے لوگ کھیل کود، ورزش اور فوجی کارناموں میں دلچسپی لیتے تھے اور ایتھنز کے لوگ علم و ہنر میں منہمک تھے۔ آج سپارٹا کو کوئی نہیں جانتا اور ایتھنز کا نام سقراط۔ افلاطون اور ارسطو کی وجہ سے ہر کسی کی زبان پر ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ انہی فلاسفہ کی وجہ سے لفظ یونان علم و حکمت کا استعارہ بن گیا۔ لیکن ساتھ ہی بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یونان کے جمہور نے اپنے دانشمندوں کی قدر نہیں کی اور سقراط کو سزائے موت دینے کے لئے زہر پینے پر مجبور کر دیا۔ اور اس کی عظمت اخلاق کا کیا کہنا کہ جب اس کے شاگردوں نے اسے بھاگ جانے کا مشورہ دیا تو اس نے اسے بداخلاقی کہہ کر بھاگنے سے انکار کر دیا۔ اس کی عظمت کا قصیدہ کہتے ہوئے کراچی کے ایک نوجوان شاعر نے کہا ہے ؎

اس پیالے میں زہر تھا ہی نہیں ورنہ سقراط مرگیا ہوتا

شکیل! اب تم ہی فیصلہ کر لو کہ تمہارا مستقبل کرکٹ کے میدان میں روشن ہوگا یا تم علم کی بارگاہ میں سر جھکا کر سرفراز ہو گے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم کرکٹ کو کھیل سمجھ کر کھیلو اور اپنا مستقبل علم سے وابستہ رکھو تاکہ کھیل اور علم کے امتزاج سے قوم کا پرنالہ چلتا رہے۔ (جاری ہے)

کراچی کے احباب کے لیے ضروری اطلاع



اب طلوع اسلام کی تمام بکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین مندرجہ ذیل پتہ پر مل سکتا ہے



محمد اقبال
48 سی، 21 کمرشل اسٹریٹ، میزانین فلور، فیز 2، ایکسٹینشن ڈی ایچ اے، کراچی رابطہ نمبر: 021-35395702, 0300-2275702

آصف جلیل
نالج اینڈ ویزڈم سنٹر، سلمان ٹاورز، آفس نمبر A-45، بالمقابل نادرا آفس، ملیر سٹی، کراچی رابطہ نمبر: 021-35421511,0333-2121992

پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پیش لفظ: قرآن جدید تحقیقات کی روشنی میں

خود کو بیان کرنا ایک نئی تفریح ہے جو آج کی فیس بک (Facebook) نے مہیا کی ہے۔ یہ مرد و زن میں یکساں طور پر پائی جانے والی ایک طاقتور قوّت (Homogenizing Force) ہے جو اس سے قبل شاید انسانی فکر کو کبھی میسر نہ تھی۔ اس میں فکری اختلافات بھی ہیں مگر کوئی بھی ان کی پروا نہیں کرتا اور اس طرح اپنی تحریروں میں مذہبی جنونی کیفیات کا احاطہ کرنے والوں، سیاسی و سماجی ہل چل پیدا کرنے والوں، ناول لکھنے والوں، مصوری کرنے والوں، اور شاعروں کو بہت سے ایسے احمق مل جاتے ہیں جو بقول آرتھر شوپن آور (Arthur Schopenhauer) ''ان کی تحریروں کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یوں ان کی نگاہ کا زاویہ معقولیت (Rationality) پر مبنی نظر آنے لگتا ہے۔ یہ جنون، فیس بک کی اس نئی تنظیم (Organization) کی شدت سے ابھرنے والی پہلی ترجیح ہے''۔ اس سے ہوتا یہ ہے کہ زندگی کے لطیف پہلو ان کی نگاہ سے اوجھل رہتے ہیں اور رفتہ رفتہ وہ انسان سے لٹھ بن جاتے ہیں۔ ہمارے ہاں انتہا پسند مذہبی دیوانوں کے ساتھ یہی کچھ ہوتا ہوا نظر آتا ہے۔

قرآنِ حکیم نے ان افراد کو وہ خشک لکڑیاں کہا ہے جنہیں سوٹ پہنا دیا گیا ہے۔ اس ضمن میں لس لی پال (Leslie Paul) اپنی کتاب، فنائے انساں (Annihilation of Man) میں یوں رقم طراز ہے: ''ڈارون اپنے خطوط میں لکھتا ہے کہ ایک مدت سے ایک ہی سمت میں سوچنے سے اس کی طبیعت نے ان تمام چیزوں سے حظ اٹھانا چھوڑ دیا جو بچپن اور جوانی سے اسے بہت محبوب تھیں۔ مثلاً شاعری، مصوری، موسیقی، مذہبی رسوم کی سختی سے پابندی، کٹر پن وغیرہ''۔ اپنی طبیعت کی اس تبدیلی کو ڈارون بہت بڑا نقصان قرار دیتا ہے۔ اس کے بعد یہی لس لی پال (Leslie Paul) لکھتا ہے کہ جو کچھ ڈارون کے ساتھ ہوا، وہی کچھ مغرب سے ہو گیا۔ اس نے ایک عرصے تک محض مادّیت (Materiality) کے نقطۂ نگاہ سے کائنات کا مطالعہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مادّیت کے علاوہ انسانی زندگی کی تمام سوتیں خشک ہو گئیں۔ قرآنِ کریم کی تفہیم کے لیے یہی کچھ ہمارے ساتھ مشرق میں ہوا، جس سے انسان انفرادی اور معاشرتی طور پر ایسا بن کر ابھرا کہ گویا اُس میں علیحدگی (Isolation) اور انفرادیت (Individualization) کے رجحانات پیدا ہو گئے اور آج مادیّت کے دور میں تشتت و انتشار عروج پر لگتا ہے، انسان اپنی فکر کی زنجیروں میں بندھ گیا ہے خواہ وہ معاشی و معاشرتی و سیاسی ہوں یا مذہبی۔ وہ انہیں ذریعۂ نجات سمجھ بیٹھا ہے۔

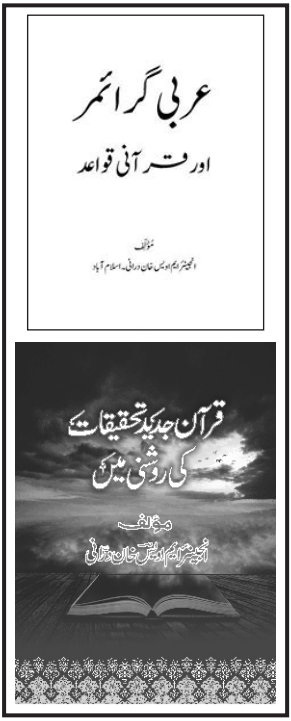
اس دور میں یوں لگتا ہے کہ مصلحینِ زمانہ کی فہرست میں ایم اویس درانی صاحب ایک ایسے انسان ہیں جو کہ پیشے کے لحاظ سے تو انجینئر ہیں مگر معاشرتی طور پر ایک ایسا نظام لانے کے لیے کوشاں ہیں جو معاشرہ میں جذب وادغام کے لیے باہمی مودّت، ایثار، خلوص، احسان، مروت، جھکاؤ، سپردگی اور دوسروں کے جذبات کی رعایت ضروری سمجھتے ہیں۔ اس سب کا تعلق انسان کی حسیات لطیفہ سے ہے، حسابی فارمولوں، منطقی مفروضوں طبیعات کے میکانکی نظریوں اور کیمسٹری کے غیر نامیاتی قاعدوں کلیوں سے نہیں۔

یوں لگتا ہے کہ ایم اویس درانی صاحب فہم قرآن کریم کے سلسلے میں عقل اور وحی میں تصادم نہیں سمجھتے بلکہ دونوں ہی ان کے نقطۂ نظر سے لازم وملزوم ہیں۔ وہ قرآنِ کریم سے رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ضروری سمجھتے ہیں کہ انسان اپنے زمانے کے تقاضوں اور اپنے دور کی فکری کاوشوں سے متعارف ہی نہیں بلکہ لسانی لحاظ سے ان ماخذات پر اس کی نگاہ گہری ہو کہ عربی زبان کے وہ الفاظ قرآن حکیم کے نزول کے وقت کیا معنی رکھتے تھے اور پھر عباسیوں کے دور میں عجمی اثرات سے متاثر ہو کر کیا سے کیا ہو گئے۔ اس لیے وہ یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ قرآنِ کریم کو محاورۂ عرب اور تصریف آیات کی رو سے سمجھا جائے کہ فلاں لفظ سے زمانۂ نزولِ قرآن میں کیا مفہوم لیا جاتا تھا اور اس پر خارجی عناصر کو قطعاً اثر انداز نہ ہونے دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی وہ مغرب کے غلط تصوّرات (Concepts) کے اصل ماخذ اور ان کے متبعین کے طرزِ خیال وعمل سے پوری پوری واقفیت لیے ہو۔ اس لیے انہوں نے اُن تصوّرات کی گہرائیوں کی جانچ پرکھ پر قلم اٹھایا ہے جن کی وجہ سے فہم قرآنِ کریم کے راستے سازشیں بھی ہوتی رہیں اور وہ تصوّرات بھی قلوب واذہان پر چھائے رہے جن سے اسلام بطور ایک نظام ابھر اور نکھر کر نئی نسل کے سامنے نہ آسکا مثلاً اعراب القرآن۔ اس سلسلے میں ان کی تحقیق یہ ہے کہ اعرابِ قرآن کا کام رسولِ اکرم ﷺ نے نہ صرف بہ نفسِ نفیس سرانجام دیا بلکہ حکم بھی دیا کہ ''قرآن پر اعراب لگاؤ''۔ نقاط القرآن کے اس سلسلہ میں انہوں نے متعدد حوالوں سے بھی ثابت کیا ہے کہ اعراب اور نقاط بہت پہلے سے عربوں میں متعارف تھے اور یہ بھی تحقیق سے ثابت کیا ہے کہ عربِ جاہلیہ کے اشعار اور کھدائیوں سے برآمد ہونے والے کتبات سے ظاہر ہوتا ہے کہ خط حمیری، جو عربی خط کا ماخذ تھا کے ذریعے عرب اسلام سے پانچ سو سال قبل ہی نقطوں اور دیگر فنی ضروریات سے آگاہ تھے۔ قرآنِ کریم نے بجا طور پر اُن کی زبان کو فصاحت وبلاغت کی زبان تسلیم کر کے ''عربیٔ مبین'' کے اعزاز سے نوازا تھا اور ان شعرائے جاہلیّہ کو قادر الکلام اس لیے کہا جاتا تھا کہ ان کے ہاں اسالیبِ سخن کی فراوانی تھی۔ اس طرح ''عربی حروف کے لیے نقطے کب ایجاد ہوئے'' کے عنوان پر تاریخ، لغت، ادب اور اشعار جاہلیت کے تناظر میں انہوں نے بڑی سیر حاصل بحث کی ہے۔

عربوں کے ہاں بات کہنے کے کئی اسلوب اور کئی طریقے مروّج تھے مثلاً استعارہ، تمثیل، قلب، تقدیم، تاخیر، خزف، کنایہ، تکرار، فحوائے کلام، اخفاء، اظہار، تعریض، افصاح، ایضام، واحد کو جمع کے صیغے سے خطاب کرنا اور جمع کو واحد کے صیغے سے، خاص لفظ سے عام معنی مراد لینا اور عام لفظ سے خاص اور تشبیہات۔ درّانی صاحب نے قریباً ان سب کا احاطہ کیا ہے

کیونکہ قرآنِ کریم کا نزول ان تمام اسالیب کلام کے مطابق ہوا ہے۔

محمد اویس درّانی صاحب نے گرامر کی غلطیوں کی سازش کو بھی تشت از بام کیا ہے۔ ان کا ''جہالت اور کم علمی کی بناء پر قرآنی گرامر میں غلطیاں'' ایک ایسا باب ہے جس کا مطالعہ فہمِ قرآنِ کریم کے لیے بڑا ہی مفید ہے۔ اس کتاب میں جمع القرآن اور ترتیب قرآن کے عنوانات بڑے ہی غور طلب ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وحی کی دس خصوصیات قرآنِ حمید میں تدّبر سے سامنے آتی ہیں اور یہ کہ وحیٔ خداوندی آج صرف قرآنِ کریم میں ہے۔ خارج از قرآن وحی کا تصوّر بالکل باطل ہے۔



اویس درّانی صاحب فہمِ قرآنِ کریم کی روشنی میں ایک نظام کی ترویج کے لیے کوشاں ہیں جس میں معاشی، معاشرتی، عبوری دور کے احکام، وراثت کے قوانین اور انسان کی تمدّنی زندگی پر جنسیاتی اثرات ان کے چند ایک وہ موضوعات ہیں جو ان کے قارئین کو گہری سوچ پہ مجبور کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ علمی دنیا کے مسلّمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئے ہیں جن کی صحت عمومی طور پر لوگوں کے نزدیک مسلمات میں سے نہیں ہے۔ اور یوں وہ علمی تصوّرات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شستہ بناتے ہیں۔

جب وہ عموماً پائے جانے والے فلسفیانہ خیال کی تردید کے لیے جن قرآنی تصوّرات کو صحیح سمجھ کر کام میں لاتے ہیں تو وہ اپنے ہی اس مؤقف پر قائم رہتے ہیں اور نہ ہی معاشرے میں پائے جانے والے غلط تصوّرات کو قبول کرتے ہیں۔ وہ اپنی اس تمام تحقیق و تدقیق میں جذبات کو غالب نہیں آنے دیتے۔ عقل اور جذبات کو وحیٔ خداوندی کے تابع رکھتے ہیں۔ اُن کے نزدیک ہر عمل جو ارادتاً سرزد ہو، بظاہر کتنا ہی معقول اور عقل پر مبنی کیوں نہ نظر آئے، درحقیقت وہ ہمارے ہی مفاد پر مبنی ہوتا ہے اس لیے وہ ضروری سمجھتے ہیں کہ عقل و فکر کا وہ عمل وحی کے تابع ہو۔

مصنف کی یہ کتاب صرف آج کے نوجوان کے لیے مختص ہے نہ کہ ان افراد کے لیے جو پہلے سے قائم کیے گئے نقطۂ ہائے نظر کی روشنی میں قرآنِ کریم کا مطالعہ کرتے ہیں۔ خدا کرے کہ ان کی یہ کتاب آنے والی نسل کے سامنے فہمِ قرآنِ کریم کے وہ تمام موانعات دور کر دے جو ان کے خیال میں اس راہ میں حائل ہیں کیونکہ ان کی اس کتاب میں تبدیلیٔ نظر و فکر کا کافی مواد موجود ہے۔

انجینئر ایم اویس خان درّانی صاحب Landline:051-2309106, Cell:0343-5369064

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نیست این کار فقیہان اے پسر

12 مارچ 2017ء کے کئی اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی کہ جناب وزیراعظم صاحب نے لاہور کی ایک جامعہ میں ان کے سالانہ سیمینار میں شرکت فرمائی ہے وہاں انہوں نے اس سیمینار سے خطاب بھی فرمایا ہماری رسائی صرف انگریزی اخبارات تک ہے جن میں ان کی Verbatim تقریر تو نہیں آئی البتہ ان کی تقریر کا ملخص آیا ہے۔ ان کی گفتگو کا مدعا یہ تھا کہ اب تک دنیا میں جو نظام چلے آرہے ہیں، یا اسلام کے نام پر جو نظام چلانے کی کوشش کی جارہی ہے وہ تمام نظام ناکام ہو چکے ہیں، اور دہشت گردی پر مبنی ہیں۔ انہوں نے علماء کرام سے یہ مطالبہ کیا ہے کہ وہ اسلام کا اصلی نظام پیش کریں جو امن پسندی، سلامتی اور محبت پر استوار ہو۔ اس رسالہ کا کوئی تعلق عملی سیاست یا ستدانوں کی ذات یا ان کے خیالات سے نہیں ہے۔ لیکن چاروں طرف سے یہی پکار ہے اور ساری دنیا ایک پُرسکوں نظام کی تلاش میں ہے۔ سابق وزیراعظم ایک سیاسی شخصیت ہیں اور سیاسی شخصیات اپنے مفادات کے حوالہ سے ہی تقاریر کرتے ہیں۔ اس لئے ہمیں ان کے خطاب سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔ البتہ جو کچھ انہوں نے اپنے خطاب میں فرمایا ہے، وہ عام لوگوں کی بھی خواہش ہے اور ہر شخص ایک نئے پُرامن نظام کی تلاش میں ہے اور پرانے نظاموں سے بیزار ہے۔ ہم اس مضمون میں عوام کی خواہش کے پیشِ نظر چند گذارشات کریں گے۔ البتہ اسلام کے اصلی اور حقیقی نظام کی تلاش میں صاحب جہاں تشریف لے گئے ہیں، اور جس مقام سے انہوں نے اسلام کا اصلی نظام کے ملنے کی توقع کی ہے، اس سے ان کی کوتاہ نظری اور خوش فہمی ظاہر ہوتی ہے۔ جبکہ یہی وہ مقام یہی وہ طبقہ ہے جو اسلام کے ترقی پذیر، اور انسانیت ساز نظام کے قیام میں ایک بڑی رکاوٹ ہے۔ ہمارے علماء کرام کے نظریات ہی اقامت دین میں مانع ہیں۔ یہ بات ہم مضمون کے آخر میں عرض کریں گے۔ ہم پہلے اسلام کا اصلی نظام پیش کرتے ہیں۔

یہ بات واضح رہے کہ اس وقت ساری دنیا میں کسی مقام پر بھی اسلامی نظام جاری نہیں ہے۔ نہ پاکستان میں اور نہ عرب میں۔ یہ سب مسلم مملکتیں ہیں۔ اس وقت جس نظام کے لئے دنیا ترس رہی ہے وہ قرآن کا ہی وہ نظام ہے جو دنیا میں امن وسکون قائم کرسکتا ہے۔ مسلمان ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ ہم اس بات پر ایمان لاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ دین، اس کا

نظام، انسانی ذہن کے وضع کردہ تمام نظاموں سے بہتر ہے فَمَنْ يَّكْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ (2:256)، جو قوم غیر خداوندی نظام سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ نظام کی صداقت پر ایمان لے آئے اور اُسے ہی اپنی اپنی زندگی کا نصیب العین بنالے تو سمجھ لو کہ اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا پکڑ لیا جو کبھی ٹوٹ نہیں سکتا۔

سب سے پہلی بات جو اقامت دین کے بارے میں پیش نظر رکھنی ضروری ہے وہ یہ ہے کہ اسلامی نظام کے قیام میں تشدد یا زبردستی کا کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ بار بار، اور جگہ بہ جگہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ ایمان اور عملِ صالح کا نتیجہ از خود غلبہ اور امن حاصل ہونا ہے، ارشاد ہے۔

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۪ وَلَيُمَكِّنَنَّ لَهُمْ دِيْنَهُمُ الَّذِي ارْتَضٰى لَهُمْ وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ وَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۵۵

(24:55)

ترجمہ: تم میں سے جن لوگوں نے ایمان قبول کیا اور اچھے کام کئے ان سے خدا نے وعدہ کیا ہے کہ ان کو روئے زمین پر ضرور اقتدار دے گا جس طرح ان لوگوں کو غلبہ دیا جو ان سے پہلے گذر چکے ہیں اور جس دین کو اس نے ان کے لئے پسند فرمایا۔ اس پر اُنہیں ضرور قدرت دے گا اور ان کے خوف کو امن میں بدل دے گا کہ وہ میری اطاعت کریں اور کسی کو میرا شریک نہ بنائیں اور جو شخص اس کے بعد بھی کفر کرے تو ایسے ہی لوگ فاسقین ہے۔

قرآن کی رو سے حکومت اور حکومت میں فرق ہوتا ہے۔ جو حکومت ایمان اور اعمالِ صالح کے نتیجے میں ملتی ہے وہ خلافت کہلائی جاتی ہے اور جو حکومت تلوار کے زور پر حاصل ہوتی ہے وہ ملوکیت اور سلطنت کہی جاتی ہے لیکن یہ بات طے شدہ ہے کہ خلافت وہ نظام ہے جو ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ذریعے ملتا ہے اور ملوکیت وہ حکومت ہے جو تلوار کے زور پر ملتی ہے۔ نیز یہ کہ یہ بھی طے شدہ بات ہے کہ مسلمان جہاں کہیں بھی کسی کے محکوم ہوں گے تو ان کا ایمان نہ قرآنی ایمان ہے نہ ان کے اعمال قرآن کی رو سے اعمالِ صالح ہیں۔ بلکہ وہ صرف ایک دھوکہ میں مبتلا ہیں۔

وَلَيُبَدِّلَنَّهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ خَوْفِهِمْ اَمْنًا ؕ ۔۔۔ ان کا خوف امن سے بدل جائے گا۔ اس سے بڑی اور نعمت اس دنیا میں اور کونسی ہوسکتی ہے کہ اس نظام میں چاروں طرف امن وسلامتی ہوجائے۔ قرآن کہتا ہے کہ خوف کی جگہ امن میں تبدیل ہوجائے گی۔ يَعْبُدُوْنَنِيْ لَا يُشْرِكُوْنَ بِيْ شَيْـًٔا ؕ (24:55) یہ صرف ہمارے قوانین کی اطاعت کریں گے اور وہ کسی اور کی اطاعت کو ہماری اطاعت میں شامل نہیں کریں گے۔

قرآن کریم جو Narrative دیتا ہے اس نے اس کو کلمہ طیبہ کہا ہے اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ (35:10)، یہ جو خدا کے کلمات یا نظریات زندگی ہیں، جن کو اس موجودہ دور میں اسلامی مملکت کہتے ہیں اسی کو قرآن نے دوسرے مقام پر شجر طیب کہا ہے (14:24) جس میں خوش گوار پھل آتے ہیں۔ یہ بھی اعمال صالحہ کے ذریعہ ہی قائم کیا جاسکتا ہے وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ ؕ (35:10) ترجمہ اور اعمال صالح اس کو بلند کرتے ہیں۔ آپ غور فرمائیں کہ قرآنِ کریم ہر جگہ واضح طور پر اعمالِ صالحہ کو ہی اسلامی نظام کے قیام کا ذریعہ بناتا ہے۔

مکہ اسلامی نظام کے مرکز کی ایک علامت ہے اور قرآن نے اس کو اس معنی میں استعمال کیا ہے۔ کعبہ بظاہر اینٹ پتھر کی ایک عمارت ہے قرآن نے فرمایا اس میں آیات بینات ہیں (3:97)، کسی عمارت میں آیات بینات کیا ہوسکتی ہیں۔ ظاہر ہے یہ اُن آیات بینات کا ذکر ہے جہاں سے وہ نظام شروع ہوگا اور اس نظام میں یہ واضح نشانیاں ہوں گی۔ مکہ کے متعلق بھی یہی فرمایا کہ اس نظام میں جو مکہ سے شروع ہوگا وہ اس قدر پُر امن ہوگا کہ جو اس نظام میں داخل ہوگیا وہ امن میں آگیا وَمَنۡ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا ؕ (3:97) ترجمہ: جو اس میں داخل ہوگیا وہ امن میں ہوگیا۔

قرآنِ کریم کے مطابق ہر شخص کا فرض ہے کہ وہ صفاتِ خداوندی کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ پیدا کرے اور اسلامی مملکت کی اساس بھی ان ہی صفاتِ باری تعالیٰ پر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات عالیہ ''المومن'' اور السلام'' بڑی نمایاں ہیں، ہر شخص کو اپنی پناہ میں لے کر اس کو سلامتی مہیا کرنا، ہر طرح کا تحفظ دینا ہر مسلمان اور ہر اسلامی مملکت کی ذمہ داری ہے۔ جس مملکت کی بنیاد امن وسلامتی، کی اقدار پر بلند ہوتی ہو، اس مملکت سے زیادہ پرسکوں اور کون سی مملکت ہوسکتی ہے۔

قرآنِ کریم کے عطا کردہ Narrative کی علامت اور نشانی یہ ہے کہ قَدۡ جَآءَکُمۡ مِّنَ اللّٰہِ نُوۡرٌ وَّ کِتٰبٌ مُّبِیۡنٌ ۙ﴿۱۵﴾ یَّہۡدِیۡ بِہِ اللّٰہُ مَنِ اتَّبَعَ رِضۡوَانَہٗ سُبُلَ السَّلٰمِ (5:15-16) اے اہلِ کتاب اللہ کی طرف سے تمہارے پاس (حق کی) روشنی اور ایک ایسی کتاب آچکی ہے جو روشن ہے اللہ اس کتاب کے ذریعے ان لوگوں پر جو اس کے قوانین سے ہم آہنگ زندگی بسر کریں، سلامتی کی راہیں کھول دیتا ہے۔ جس کا بتایا ہوا راستہ نوعِ انسانی کو اس کی منزل تک لے جاتا ہے جسے دارالسلام، یعنی امن کا گھر کہا جاتا ہے۔ لَہُمۡ دَارُ السَّلٰمِ عِنۡدَ رَبِّہِمۡ وَہُوَ وَلِیُّہُمۡ بِمَا کَانُوۡا یَعۡمَلُوۡنَ ﴿۱۲۷﴾ (8:127) (ترجمہ) ان لوگوں کے لئے ان کے پروردگار کے نزدیک سلامتی وعافیت کا گھر ہے اور وہ ان کے اعمالِ حسنہ کی وجہ سے ان کا مددگار اور رفیق ہے۔ یہی وہ سلامتی کا گوشہ ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ دعوت دیتا ہے وَاللّٰہُ یَدۡعُوۡۤا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ ؕ وَیَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۲۵﴾ (10:25) ترجمہ: اور اللہ سلامتی کے گھر کی طرف بلاتا ہے اور جو چاہتا ہے اسے کامیابی کی راہ پر لگا دیتا ہے اور اس تمام محنت وسعی کا مقصود ومنتہیٰ سلامتی کی جنت ہے اِنَّ الۡمُتَّقِیۡنَ فِیۡ جَنّٰتٍ وَّ عُیُوۡنٍ ؕ﴿۴۵﴾ اُدۡخُلُوۡہَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیۡنَ ﴿۴۶﴾ (15:45-46) ترجمہ: بلاشبہ متقی لوگ باغوں اور چشموں میں ہوں گے (اُنہیں

کہا جائے گا) سلامتی کے ساتھ بہ اطمینان ان باغوں میں داخل ہو جاؤ۔

یہاں تک تو ہم نے عرض کیا ہے کہ قرآن کے بیانیہ کو تشدد اور دہشت گردی سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ بیانیہ صرف ایمان اور اعمالِ صالحہ کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

انسانوں نے جب سے آپس میں مل جل کر زندگی بسر کرنی شروع کی ہے تو انہوں نے خود سوچ سمجھ کر کوئی نظام وضع نہیں کیا تھا از خود زندگی گذارنے کے طریقے سامنے آتے چلے گئے۔ پہلے چھوٹے چھوٹے قبیلے بنے پھر آہستہ آہستہ قومیں بنتی چلی گئیں۔ پھر مختلف ممالک وجود پذیر ہوئے، اور ان میں قومی حکومتیں قائم ہوتی گئیں۔ آج نظام جمہوریت کا بہت چرچا ہے۔ لیکن یہ بات واضح رہے کہ جمہوریت کوئی نظام یا کوئی آئیڈیالوجی نہیں ہے۔ نہ جمہوریت کے کوئی مقاصد ہیں اور نہ اس کی کوئی اساس ہے۔ ہندوستان میں 70 سال سے جمہوریت ہے۔ لیکن جمہوریت کی وجہ سے ان کا کلچر، تمدن، اور رہن سہن میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جو عیوب ان میں پہلے تھے وہ اب بھی ہیں۔ وہاں آج بھی کمیوں دلت کی جو حالت ہے اُسے دیکھ کر آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ جمہوریت کا دعویٰ یہی ہے کہ اس میں سب لوگ برابر ہوتے ہیں۔ لیکن اس دعویٰ کی عملاً صورت یہ ہے کہ وہاں دلت کا درجہ جانوروں کے برابر ہے۔ عقل انسانی نے خود کوئی نظام وضع نہیں کیا۔ البتہ صرف کمیونزم کا نظام بہت غور وخوص کے بعد بنایا گیا۔ لیکن اس میں دو عیب تھے۔ ایک تو تشدد، اور حکومت کا جبر بہت تھا دوسرے اس نظام کی اساس نہیں تھی اور اس کا اعتراف مارکس نے خود بھی کیا تھا کہ کوئی ایک شخص ہزار روپے کما کر اپنا ضرورت سے زیادہ سرمایہ دوسرے کو کیوں دے۔ اس کی وجہ اسے سمجھ میں نہیں آئی اور اسی وجہ سے وہ نظام ناکام ہو گیا۔ سیکولر حکومتیں مقصود بالذات ہوتی ہیں۔ ان کے سامنے حکومت کے بلند مقاصد نہیں ہوتے۔ بلکہ اسلامی مملکت، قرآنی بیانیہ مقصود بالغیر ہوتا ہے اور وہی مقصود بالغیر اس بیانیہ کی اساس ہے اور اس مملکت کے سامنے بلند مقاصد کا حصول ہوتا ہے۔

قرآنِ کریم انسانوں کے وضع کردہ نظام ہائے حیات پر دو اعتراض وارد کرتا ہے جن کی وجہ سے وہ نظام رہنے کے قابل نہیں ہوتے اور قرآنِ کریم ان نظاموں میں زندگی بسر کرنا جرم قرار دیتا ہے (6:123)۔

قرآنِ کریم پہلا اعتراض یہ کرتا ہے کہ عقل انسانی خیر وشر کا تعین نہ آج کر سکتی ہے اور نہ آئندہ کبھی کر سکے گی۔ قرآنِ کریم کا یہ بہت بڑا چیلنج ہے جو آج تک اپنی جگہ جم کے کھڑا ہے۔ مغربی فلاسفرز اور دانشوروں کے نزدیک خیر وشر کا تعلق عقل سے نہیں ہے بلکہ وہ ان کے نزدیک خیر وشر کا تعین نہیں کر سکتی۔ اس طریقہ سے اُنہوں نے عقل کی شکست اور نارسائی کو تسلیم کر لیا۔ چونکہ جذبات ہر شخص کے انفرادی ہوتے ہیں اس لئے پھر خیر وشر کا تعین بھی انفرادی ہوگا۔ مغربی مفکرین اخلاقیات بھی اضافی ہی مانتے ہیں۔ ارشاد عالی ہے وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝۲۱۶ (2:216) ترجمہ اور شاید کہ تم کو ایک چیز بُری لگے اور وہ تمہارے لئے اچھی ہو اور شاید

کہ تم کو ایک چیز بھلی لگے اور وہ تمہارے لئے بُری ہو اور اللہ ہی جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔ یعنی یہ بات ضروری نہیں کہ جس چیز کو تم اپنے حق میں نافع یا مضر سمجھو اور وہ مفید ہو اور کسی چیز کو مفید سمجھو اور وہ تمہارے لئے نقصان دہ ہو۔ تمہارا نفع و نقصان خدا ہی خوب جانتا ہے تم اسے نہیں جانتے۔ قرآنِ کریم کا موقف یہ ہے کہ ایسے مقامات پر صحیح فیصلہ کرنا جہاں ایک طرف دنیاوی نقطۂ نظر سے مفاد ہی مفاد نظر آ رہے ہوں اور دوسری طرف دنیاوی نقطۂ نگاہ سے بظاہر نقصانات ہی نظر آ رہے ہوں۔ تمہارے بس کی بات نہیں ہوتی۔ کیونکہ ہر شخص کی عقل اپنا ہی فائدہ سوچتی ہے۔ عقل خود بین غافل از بہود غیر۔ حقیقت تک نارسائی کی وجہ سے عقل انسانی درست نظام وضع نہیں کر سکتی۔

قرآنِ کریم کا دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اگر انسانوں کو قانون سازی کا حق دے دیا جائے تو یہ کبھی بھی صحیح قانون وضع نہیں کر سکتے۔ بلکہ باری تعالیٰ عزاسمہ نے فرمایا ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿44﴾ (5:44) الظّٰلِمُوْنَ ﴿45﴾ (5:45) الْفٰسِقُوْنَ ﴿47﴾ (5:47) ترجمہ جو لوگ اللہ کے نازل کردہ (قانون) کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ ہی کافر ہیں، ظالم ہیں اور فاسق ہیں۔ ان آیات کی تفسیر کے ذیل میں، مولانا مودودی مرحوم نے بہت خوب تحریر فرمایا ''یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کئے ہیں ایک یہ کہ وہ کافر ہیں، دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں اور تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے وہ دراصل ان تین جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اولاً اس کا یہ فعل حکمِ خداوندی سے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے۔ ثانیاً اس کا یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہو سکتا ہے وہ تو خدا نے دے دیا تھا اس لئے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو یہ ظلم ہوا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہو کر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت بندگی اور اطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالا اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر، ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے انحراف از حکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہوا اور ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف موجود ہو وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں۔ (تفہیم القرآن جلد اوّل، صفحہ: 475)۔ قرآنِ کریم تو انسانوں کو قانون سازی کا اختیار ہی نہیں دیتا۔ ہمارے ہاں عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ فلاں صاحب نے یا فلاں پارٹی نے دستور کے تقدس کو پامال کر دیا۔ لیکن انسان کے بنائے ہوئے کسی قانون کا کوئی تقدس نہیں۔ مَّا نَزَّلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ (7:71) ترجمہ: اللہ نے اس کے لئے کوئی سند نازل نہیں کی۔ تقدس صرف ان چیزوں کا ہوتا ہے جن کے ساتھ خدا کی سند موجود ہوتی ہے۔ حضور ﷺ کو بھی یہی حکم تھا فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ (5:48) اللہ نے جو نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلے کرو۔ تمام انبیاء کرام اپنے ساتھ وحی، کتابِ الٰہی،

لاتے تھے اور اس کے مطابق فیصلے کرتے تھے (2:213)۔

حضور ﷺ نے، اور آپ کے ساتھیوں نے حد درجہ محنت شاقہ کے بعد ایک نظام قائم کیا جس میں قرآنِ کریم کے احکامات جاری کئے۔ حضور ﷺ نے اپنے دور کے لئے مقامی حکام بھی جگہ بہ جگہ مقرر فرما دیئے تھے۔ ان مقامی حکام کو قرآنِ کریم نے اولوالامر کے نام سے موسوم کیا ہے اور جب دو پارٹیوں میں کوئی جھگڑا ہوتا تھا تو دونوں پارٹیاں حضور ﷺ کے سامنے فیصلہ کرانے مدینہ نہیں آتی تھیں بلکہ اپنے اپنے علاقہ کے حاکم سے اس جھگڑے کا فیصلہ کروالیتی تھیں۔ اس مقامی حاکم کی اطاعت حضورؐ کی ہی اطاعت گردانی جاتی تھی۔ اولواالامر کی اطاعت کی فرضیت سے چار نتائج برآمد ہو کر سامنے آئے۔

سب سے پہلے تو یہ نتیجہ برآمد ہوا کہ اولواالامر کی اطاعت سے اسلام مذہب کی سطح سے بلند ہو کر دین کے زمرہ میں داخل ہو گیا، اور ایک عملی نظام قائم ہو گیا۔ اور انسانیت پہلی مرتبہ ایک نظام کے تصور سے آگاہ ہوئی۔ دوسری بات یہ ہوئی کہ اب انسان کی حکومت دوسرے انسانوں پر حرام ہو گئی انسان براہِ راست قوانینِ خداوندی کے نیچے آ گیا اور اصلی آزادی کی نعمت پا گیا اس کا تیسرا نتیجہ یہ ہوا کہ حضورؐ کی ذاتی اطاعت کا تصور بھی ختم ہو گیا (3:79) اور اولواالامر کی اطاعت میں اللہ و رسولؐ کی اطاعت قرار پا گئی، اور پرستش کی کوئی گنجائش ہی نہیں رہی۔ اللہ کا دیا ہوا دین جس کو حضور ﷺ نے اس دنیا میں عملی شکل میں جاری کیا تو اس کی اطاعت اللہ و رسول کی اطاعت ہو گئی کیونکہ اس میں قوانین تو اللہ کے تھے اور جاری رسول اللہ کر رہے تھے تو اس کی اطاعت میں دونوں شامل ہو جاتے ہیں۔

اس نظام کی جو اساس محکم ہے اور جس مقصد کے لئے یہ نظام قائم کیا جاتا ہے اب وہ پیش خدمت عالی کیا جاتا ہے۔ اسلامی نظام کی یہ Unique خصوصیت ہے۔ زندگی The Life ہزاروں، لاکھوں سال میں آہستہ آہستہ ترقی کرتی ہوئی حیوانیت کی سطح پر پہنچی اور جب حیوانیت کی سطح سے بلند ہوئی اور اس کو اگلی منزل میں داخل ہونا ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف سے ایک توانائی ایک صلاحیت عطا فرمائی جس کو قرآنِ کریم نے روح کے لفظ سے تعبیر کیا (15:29، 12 :38، 32:9)۔ یہ توانائی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب رہی تو یہ روحِ خداوندی کہلائی اور جب یہ توانائی نوعِ انسانی کو مل گئی تو قرآنِ کریم نے اس کو نفس انسانی کے نام سے تعبیر کیا۔ توانائی تو یہ ایک ہی ہے۔ لیکن ان میں فرق یہ ہے کہ جب یہ توانائی انسانیت کو بہ حیثیت ایک نوع کے مجموعی طور پر ملتی ہے تو یہ نفس انسانی کے نام سے پکاری جاتی ہے اور یہ توانائی ہی انسانیت کو حیوانیت سے ممیز کرتی ہے اور صاحب ارادہ و اختیار بناتی ہے۔ عام طور پر لوگ انسان کو ''جسم اور روح'' کا مجموعہ تصور کرتے ہیں لیکن قرآنِ کریم انسان کو ''جسم اور نفس'' کا مرکب قرار دیتا ہے۔ قرآنِ کریم روحِ خداوندی کا تو قائل ہے لیکن روحِ انسانی کو تسلیم نہیں کرتا۔ جس وقت قرآنِ کریم نازل ہو رہا تھا، اس وقت ہر جگہ چاروں طرف روحِ انسانی کا ہی چرچا تھا۔ لیکن قرآنِ

کریم کا یہ ایک اعجاز ہے کہ اس نے اس وقت نفسِ انسانی کا تصور دیا، جو بالکل منفرد اور انوکھی چیز تھی اور نفس کی نشوونما اور اس کی پرورش کو زندگی کا مقصد قرار دیا۔ سیکولر سٹیٹ میں رہنے والے اس نفسِ انسانی کے قائل نہیں ہوتے اس لئے ان کی زندگی حیوانیت کی سطح تک ہی بلند ہوتی ہے وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12) ترجمہ اور وہ لوگ جو کافر ہیں دنیا کی چیزوں کو استعمال کرتے ہیں اور جانوروں کی طرح کھاتے ہیں حالانکہ انسان کی زندگی کا مقصد ہی نفسِ انسانی یا ذاتِ انسانی کو نشوونما دینا ہے۔

جب ایک بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ چند انچ کا جسم اور نفس کا مرکب ہوتا ہے۔ نفس اور جسم دونوں کی پرورش کرنا اس کا فرض ہوتا ہے۔ بچہ کے جسم کی پرورش طبعی قوانین کے مطابق ہوتی ہے، اچھی غذا کھانے سے اس کے جسم کی اچھی پرورش ہوتی ہے اور وہ تقریباً 5 یا 6 فٹ کا ہو جاتا ہے۔ انسانی نفس کی پرورش کے طریقے یہ ہیں کہ جو شخص مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کرے گا اس کے نفس کی پرورش ہوگی اور دوسری بات یہ ہے صفاتِ خداوندی کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ پیدا کرنے سے نفسِ انسانی نشوونما حاصل کرتی ہے۔

عقلِ انسانی مستقل اقدار کا تعین نہیں کر سکتی۔ یہ وہ مقام ہے جہاں انسانیت وحی الٰہی کی محتاج ہوتی ہے۔ (1) نفس کی ترقی کے لئے پہلی اور اہم ترین مستقل قدر یہ ہے الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ (92:18) جو شخص اپنا مال دوسروں پر خرچ کرتا ہے، اس کے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے۔ قرآنی اقدار کے مطابق زندگی بسر کرنے سے نفس کا تزکیہ ہوتا ہے وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ (35:18) (2) جو شخص دوسروں کی پرورش کرتا ہے اس سے اس کے اپنی نفس کی پرورش ہوتی ہے۔ (3) چونکہ انسانی ذات ہر انسانی بچہ کو یکساں طور پر ملتی ہے۔ اس لئے ہر انسان صرف انسان ہونے کی جہت سے واجب الاحترام ہے وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) ترجمہ: ہم نے تمام انسانوں کو واجب التکریم بنایا ہے۔ لہٰذا احترام انسانیت ایک مستقل قدر ہے۔ اس سے ذات پات، حسب نسب، رنگ نسل کے تمام امتیازات بھی دفن ہو گئے۔ (4) عدل ایک مستقل قدر ہے وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫ (5:8) ترجمہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم عدل نہ کرو، بہر حال عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔ (5) کسی شخص کی ذمہ داری دوسرا شخص نہیں اٹھائے گا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ؕ (39:7) ترجمہ، کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا (6) کوئی کسی کا غلام یا محکوم نہیں ہو سکتا۔ وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) تم سے پوچھتے ہیں کہ کس قدر دوسروں کے لئے خرچ کریں کہہ دو جو تمہاری ضرورت سے زائد ہے۔ (7) جس شخص کے لئے نکاح کی صورت پیدا نہ ہو وہ ضبطِ نفس سے کام لے اور اپنی عصمت کی حفاظت کرے وَلْيَسْتَعْفِفِ الَّذِيْنَ لَا يَجِدُوْنَ نِكَاحًا حَتّٰى يُغْنِيَهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ؕ (24:33) (8) پوری نوعِ انسانی ایک اُمتِ واحدہ ہے (10:19) (9) وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ

النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِي الْأَرْضِ ط (13:17) ترجمہ زمین میں ہمیشگی اور دوام اسی کو حاصل ہے جو تمام نوعِ انسانی کے لئے نفع بخش ہے۔ (10) لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ﴿٣٩﴾ (53:39) ترجمہ کسی انسان کو سوائے اس کی محنت کے اور کچھ نہیں ملتا۔ ہم نے یہ دس مستقل اقدار تحریر کی ہیں ان اقدر پر عمل کرنے سے انسانی ذات میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔ ذات کے استحکام کی خاطر اسلامی مملکت کے شہری ان اقدار پر عمل کرتے ہیں لیکن اس کا By-Product یہ ہوتا ہے کہ معاشرہ بہترین سے بہترین ہوتا جاتا ہے۔ اسلامی مملکت کا شہری کسی کا حرام مال نہیں کھاتا تاکہ اس کی ذات پر بُرا اثر نہ ہو۔ وہ اس لئے کوئی جرم نہیں کرتا کہ جرم کے ارتکاب سے اس کا نفس مضمحل ہوتا ہے۔ اس طرح اسلامی مملکت میں جرائم کم ہو جائیں گے، کوئی حرام مال نہیں کھائے گا۔ اس مملکت میں ایک شہری دوسرے شہری کی اس لئے پرورش کرتا ہے تاکہ اس کی اپنی ذات کی پرورش ہو۔ ہر وہ کام جو نفس کی پرورش کے لئے کیا جائے گا، اس کا اسی قدر فائدہ سٹیٹ کا ہوگا اور اس کا استحکام بڑھتا جائے گا اس طرح اسلامی مملکت تزکیۂ نفس کے ذریعے بنتی ہے اور اس کے قیام کا مقصد تزکیۂ نفس بن جاتا ہے۔ اس ریاست سے تزکیۂ نفس کے بلند مقاصد حاصل ہوتے ہیں اور زندگی نئی منازل طے کرتی چلی جاتی ہے۔

نفس انسانی کے تزکیہ کے لئے مستقل اقدار پر عمل کرنے کے علاوہ دوسرا ذریعہ ہم نے تحریر کیا تھا کہ صفاتِ خداوندی کو اپنے میں زیادہ سے زیادہ منعکس کرنے سے تزکیۂ نفس ہوتا ہے۔ ہم اب اس کی وضاحت عرض کرتے ہیں۔

اس عالم کو پیدا کرنے کی غرض یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات کا مظاہرہ ہو۔ کوئی مذہب یا کوئی انسان جو خدا کو فاعل مختار مانتا ہے انجام کار اس کے سوا دوسری غرض نہیں بتا سکتا۔ تخلیقِ عالم کی غرض ہی یہ ہے کہ اس کی صفات پر عمل ہو۔ اور ان صفات کا ظہور ہو۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ط يَتَنَزَّلُ الْاَمْرُ بَيْنَهُنَّ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا ﴿١٢﴾ (65:12) یعنی زمین و آسمان کی تخلیق اور ان کے کل نظم و نسق سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی قدرت کاملہ اور علم محیط کا علم لوگوں کو حاصل ہو۔ تخلیقِ عالم کی یہ غرض جب ہی پوری ہو سکتی ہے کہ مخلوقات میں اس کی ہر قسم کی صفات و کمالات کا اظہار ہو اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ اس عالم میں مطیع وفادار اور باغی اور مجرم ہر قسم کی مخلوق موجود ہو اس نے اس دنیا کا سارا نظام ہی ایسا رکھا ہے کہ بندوں کو خیر و شر کے اکتساب میں مجبور نہ بنایا جائے۔ اگر صرف خیر کی قدرت پر سب کو مجبور کر دیا جاتا تو تخلیقِ عالم کی حکمت و مصلحت پوری نہ ہوتی اور اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی رہ جاتیں کہ ان کے اظہار کے لئے کوئی موقع نہ رہتا۔ مثلاً عفو، منتقم الشدید قائم بالقسط کا مظاہرہ نہ ہو سکتا۔

صفاتِ باری تعالیٰ عز اسمہٗ کا تقاضہ ہے کہ ان پر عمل کیا جائے اور ان کا اس دنیا میں جگہ بہ جگہ، وقت بہ وقت مظاہرہ ہونا ہے۔ ہر شخص ان کو اپنے اندر پیدا کرے۔ جتنی جتنی صفات کوئی شخص اپنے میں منعکس کرتا چلا جائے گا، اسی قدر قربِ خداوندی

اس کو حاصل ہوتا رہے گا۔ اسلامی مملکت کی اساس بھی یہی صفاتِ خداوندی ہوتی ہے۔

مستقل اقدار پر عمل کرنے اور صفاتِ خداوندی کو اپنے میں منعکس کرنے سے نفسِ انسانی کی نشوونما ہوتی ہے۔ ہم نے اوپر اس نظام کے حوالہ دیا ہے جو حضور ﷺ نے مدینہ میں قائم فرمایا تھا۔ اس نظام میں مستقل اقدار اور صفاتِ خداوندی پر عمل کیا جاتا تھا۔ مستقل اقدار پر عمل کرنے اور صفاتِ خداوندی کو ظہور میں لانے کے لئے ضروری ہے کہ اسلامی نظام قائم کیا جائے۔ سیکولر سٹیٹ میں نہ مستقل اقدار پر عمل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی اس میں صفاتِ خداوندی ظہور میں لائی جاسکتی ہیں۔ وہ نظام مقصود بالذات نہیں ہوتا بلکہ وہ نظام اس لئے قائم کیا جاتا ہے کہ اس میں زندگی بسر کرنے سے نفس انسانی کی نشوونما ہوتی ہے۔ زندگی ناقابل تقسیم ہے یہ نہ طولاً تقسیم کی جاسکتی ہے نہ عرضاً۔ اسلامی مملکت میں زندگی بحیثیت مجموعی ترقی کرتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات مکمل ترین اور Perfect ذات ہے۔ جو لوگ صفاتِ خداوندی کو اپنے میں منعکس کرتے ہیں وہ بہترین سیرت کے حامل ہوجاتے ہیں۔ عقل انسانی خیر وشر میں تمیز نہیں کرسکتی۔ اس کے تقابل میں مستقل اقدار جو وحی کے ذریعے ملی ہیں۔ ان دونوں کا تقابل بھی نہیں ہوسکتا۔ جس مملکت کے شہری، صفاتِ خداوندی کو اپنے میں منعکس کرتے ہیں، اور مستقل اقدار پر عمل کرتے ہیں، ان سے زیادہ پختہ سیرت اور کوئی نہیں ہوسکتا اور چونکہ اس ریاست کی اساس بھی ان ہی دونوں چیزوں پر ہوتی ہے، اس لئے اس ریاست سے بہتر اور کوئی ریاست نہیں ہوسکتی۔ صفاتِ خداوندی کے مطابق عمل کرنے سے انسانیت کی خدمت ہوتی ہے۔ جیسا کہ ہم اس مضمون میں لکھتے چلے آرہے ہیں۔ اس ریاست کے شہریوں کی زندگی کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے۔

اس مختصر سی تمہید کے بعد اب ہم آپ کے سامنے Quranic Narrative، کو Sum up کرتے ہیں۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ حضور ﷺ نے قرآنی بیانیہ کی کن چمکدار الفاظ میں تعریف کی ہے۔ ہمارا یہ مضمون طلوع اسلام نومبر 2014ء میں صفحہ نمبر 30 پر طبع ہوا تھا۔

''البتہ اب ہم ان صفاتِ عالیہ کو ریاست سے Relate کرتے ہیں کہ ان صفاتِ عالیہ کا ریاست سے کیا تعلق ہوتا ہے۔ اسلامی ریاست کی اساس صفاتِ خداوندی پر ہوتی ہے۔ یہی مستقل اقدار ہوتی ہیں اور یہی حقوقِ انسانی ہوتے ہیں۔ ہر اسلامی ریاست کو، عادل، رازق، حکیم، علیم، خبیر، قوی، عزیز، رحیم وغیرہ ہونا چاہئے۔ میری ذات کا بھی یہ تقاضہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ کی صفات کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے، عدل، حکمت، صبر، سماعت، بصارت وغیرہ سے کام لوں میں جب ریاست کے اس فیصلہ کی اطاعت کرتا ہوں جو عدل پر مبنی ہے تو میری یہ اطاعت اس ریاست کی اطاعت نہیں ہوتی بلکہ یہ میری ذات کے ایک تقاضہ کی اطاعت اور اس تقاضہ کو پورا کرنا ہوگا جس طرح پانی پینے سے میں کسی کی اطاعت نہیں کرتا بلکہ اپنی ذات کا ایک تقاضہ پورا کرتا ہوں۔ اسی طرح جب اسلامی ریاست اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کے تقاضہ کو

پورا کرتی ہے تو اس کی اطاعت میری اپنی ذات کی اطاعت ہوتی ہے اور اپنی ذات کا ایک تقاضہ پورا کرنا ہوتا ہے۔ ہم سب اللہ تعالیٰ کی صفات پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کو رازق، عادل، رحیم، کریم، رب مانتے ہیں۔ لیکن ہمارا یہ عقیدہ صرف مجرد صفات (Abstiact) پر ہے۔ لیکن جب اسلامی ریاست اللہ تعالیٰ کی صفات کو روبرعمل لاتی ہے اور رزق فراہم کرتی ہے، سب کی ربوبیت کرتی ہے۔ سب کے ساتھ عدل کرتی ہے۔ تو اس طرح صفاتِ خداوندی ایک محسوس، مرئی ٹھوس شکل میں سامنے آجاتی ہے اور تمثیلاً اور تشبیہاً اس طرح اللہ تعالیٰ اپنی صفات عالیہ وکمالیہ کے ساتھ زمین میں آکر نورفشاں ہوجاتا ہے۔ اسلامی مملکت میں اس کی اطاعت کرنے کی وجہ سے انسانی ذات کی نشوونما ازخود ہوتی چلی جاتی ہے اور اس طرح انسانی ذات اور اسلامی معاشرہ کا تزکیہ ہوتا جاتا ہے۔ یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ جس طرح طبعی قوانین کا علم حاصل کرنے سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ اسی طرح وحی خداوندی کا علم، اور مستقل اقدار پر عمل کرنے سے قوت حاصل ہوتی ہے۔ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾ (11:66) بیشک تیرا رب وہی ہے قوت والا اور غلبہ والا۔ جب اس صفتِ خداوندی کو منعکس کیا جائے گا تو لازم ہے کہ ریاست قوی اور غلبہ والی ہوگی۔ یہی وہ نظام ہے جو ظل اللہ فی الارض ہوتا ہے۔ اس نظام کی تعریف کرتے ہوئے حضور ﷺ نے فرمایا تھا: لقد ترکت علی مثل البیضاء لیلھا ونھارھا سواء۔ میں تم میں وہ ملت بیضا چھوڑے جارہا ہوں جس کی رات اس کے دن کی مانند روشن ہوتی ہے۔ لیکن افسوس کہ آج اس بدنصیب قوم کا دن بھی رات کی طرح تاریک ہے۔ اگرچہ یہ مضمون طویل ہوگیا ہے اور علماء کرام کے بیانیہ کی گنجائش نہیں رہی جو وہ پیش کرسکتے ہیں۔ لیکن اس کے بغیر مضمون بھی پورا نہیں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے ہم مختصر ترین الفاظ میں علماء کرام کے بیانیہ کے متعلق چند گذارشات پیشِ خدمت عالی کرتے ہیں۔

جہاں تک علماء کرام کا بیانیہ کا تعلق ہے اس پر اس شعر سے بہتر اور کوئی تبصرہ نہیں ہوسکتا۔

خشتِ اول چوں نہد معمار کج تا ثریا می رود دیوار کج

مفہوم: جب معمار نے دیوار کی پہلی اینٹ ہی ٹیڑھی رکھی ہے دیوار تو ثریا کے ستاروں تک ٹیڑھی ہی اٹھے گی۔

آیۂ کریمہ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ (15:29) اور ہم نے اس میں اپنی طرف سے روح پھونک دی۔ ہم نے اسی مضمون میں عرض کیا ہے کہ اس آیۂ کریمہ میں جب روح کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد روحِ خداوندی ہوتی ہے اور جب اس کی نسبت انسان کی طرف ہوتی ہے تو اس سے مراد نفسِ انسانی ہوتی ہے۔ کیونکہ قرآنِ کریم روحِ خداوندی کا تو قائل ہے، لیکن وہ روحِ انسانی کو تسلیم نہیں کرتا، ہمارے علماء کرام سے یہ تسامح ہوا ہے کہ وہ اس باریک فرق کو Detect نہیں کرسکے اور اُنہوں نے نفسِ انسانی کا انکار کیا، اور روح انسانی کو انسانیت کی اساس قرار دیا۔ مغربی مفکرین، سیکولر حکومتوں کے داعین، اور ہمارے علماء کرام نفس انسانی کے منکر ہیں۔ اس معاملہ میں مغربی مفکرین اور ہمارے

علماء کرام ایک Page پر ہیں لیکن چونکہ قرآنِ کریم نفس انسانی کا قائل ہے اس لئے اس نے نفس انسانی کی نشوونما کے طریقے بھی خود تحریر کئے ہیں جو ہم نے اس مضمون میں تحریر کر دیئے ہیں۔ لیکن چونکہ قرآن کریم روحِ انسانی کا قائل ہی نہیں ہے اس لئے اس نے روح انسانی کی نشوونما کے طریقے بھی نہیں بتائے۔ قرآنِ کریم میں تو روحانیت کا لفظ تک نہیں آیا۔ لیکن ہمارے علماء کرام کے نزدیک زندگی کا مقصد ہی روحانیت حاصل کرنا ہے۔ روحانیت کے حصول کے لئے ہمارے علماء کرام نے جو طریقے اختیار کئے وہ قوم کو تباہ و برباد کرنے کے لئے کافی ہیں۔

صوفیائے کرام کے زیر اثر ہمارے علماء کرام وحدت الوجود کے قائل ہوئے ہیں۔ ہمارے سامنے فارسی زبان کے شعراء، مولانا روم سمیت، اور اردو زبان کے شعراء غالب سمیت، سب وحدت الوجود کے قائل ہیں۔ وحدت الوجود کے معنی یہ ہیں کہ وہ اس عالم محسوس کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ وحدت الوجود کے معنی یہ ہیں کہ یہ کائنات جو ہمیں اس طرح محسوس، Concrete شکل میں دکھائی دے رہی ہے اپنا وجود نہیں رکھتی۔ اس عقیدہ کا منطقی نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے علماء کا کائنات کے متعلق منفیانہ اندازِ نگاہ بن جاتا ہے۔ غالب نے کہا۔

ہستی کے مت فریب میں آ جائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

ہمارے علماء کا یہ عقیدہ بالکل قرآن کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے کہ کائنات کا وجود بالحق ہے (29:44)، کائنات کے متعلق جو علم حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے، اس کو علماء قابلِ اعتماد ہی نہیں سمجھتے۔ ان کے ہاں علم کے ذرائع باطنی ہیں اور وہ صرف باطنی علم کو ہی علم سمجھتے ہیں لیکن یہ نظریہ بھی قرآن کے خلاف ہے۔ پھر ان ہی علماء نے مادہ کو قابل نفرت اور روح کے مقابل لا کھڑا کیا۔ ان کے نزدیک جس قدر مادہ سے نفرت ہوگی۔ اسی قدر روحانیت میں اضافہ ہوگا۔ ان کے نزدیک روحانیت پرستش کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور پرستش انفرادی فعل ہے۔ اس کے لئے کسی معاشرہ یا ریاست کی ضرورت ہی نہیں۔ روحانیت میں ترقی اور وظائف، بڑے بڑے چلوں سے ہوتی ہے۔ یہ تمام چیزیں پہاڑوں، جنگلوں، صحراؤں، گوشوں، کونوں، زاویوں میں ہوتی ہیں ان میں معاشرہ کی ضرورت نہیں۔ روحانیت انفرادیت کی داعی اور اجتماعیت کی دشمن ہے۔ معمولی سا غور کرنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ علماء کرام کے پاس کوئی بیانیہ ہو ہی نہیں سکتا وہ بیانیہ کے قائل ہی نہیں۔ ان کے ہاں نظام کا تصور ہی نہیں۔ نہ اس کی ضرورت ہے۔ ہمارے علماء کرام کے عقائد انہیں اقامتِ دین کی اجازت ہی نہیں دیتے۔

ہمیں افسوس ہے کہ مضمون کی طوالت کی وجہ سے ہم اصل نکتہ کہ ہمارے علماء کرام نظام کے قائل نہیں ہیں، اس کے متعلق کچھ زیادہ نہ تحریر کر سکے، حالانکہ اصل نکتہ ہی وہ تھا۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط نمبر 7)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

عربوں کے ہاں یہ لفظ عَوَدَ موجود تھا، جسے قرآن نے استعمال کیا، جس کے معنی ارتقائی گردشیں دیتے ہوئے، شے کو اس طرح آگے تکمیلی نقطے تک بڑھانا کہ پھر اس کے بعد مزید گردشوں کی ضرورت نہ رہے۔ یہ تکمیلی مقام شے کی آخری منزل ہوتا ہے۔ ہر شے کو نقطہء آغاز سے پیدا کر کے، ارتقائی گردشیں دینے میں عربوں کے ہاں شفقت اور مہربانی، نرمی اور سہولت کا تصوّر بھی ہے۔ یعید کے معنی ہیں بار بار آنے والی، لیکن وہ بار بار آنے والی شے، جس میں شفقت، مہربانی، نرمی اور سہولت کی چیز بھی ہو اور ساتھ ساتھ اس میں ارتقائی گردشیں اس طرح ہوں کہ معاد یعنی تکمیل تک لے آئے۔ اسی کو اِنَّہٗ ھُوَ یُبۡدِئُ وَیُعِیۡدُ کہا گیا ہے۔

ہماری اپنی دنیا میں جب سائنسدان علّت و معلول کی کڑیاں ملاتے ہوئے پیچھے کی طرف جاتے ہیں، یعنی یہ چیزیوں بنی، پھر وہ چیزیوں بنی اور اسی طرح جب آخر میں پہنچتے ہیں، تو حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے ہیں کہ یہ اوّل مرتبہ کیسے بنا؟ دنیا کا بڑے سے بڑا سائنسدان بھی جواب نہیں دے سکتا کہ کائنات اور ہم عدم سے کیسے وجود میں آئے؟

ھَلۡ اَتٰی عَلَی الۡاِنۡسَانِ حِیۡنٌ مِّنَ الدَّہۡرِ لَمۡ یَکُنۡ شَیۡئًا مَّذۡکُوۡرًا ① (76:1)

کیا زمانے (الدہر) میں، انسان پر ایسا وقت نہیں گزرا، جب وہ انسانی وجود میں نہ تھا؟ (یعنی مخاطب کرنے کے قابل ہی نہ تھا)۔

لم یکن شیئًا مذکوراً: ''جب انسان، انسانی وجود میں نہ تھا''۔ ہمارے ہاں اردو میں ''مذکور'' کے معنی ''قابل ذکر یا جس کا ذکر پہلے ہو چکا'' ہوتے ہیں، لیکن عربی میں مذکور کے معنی ہیں'' وہ جو خود اپنے وجود میں موجود ہو یعنی Self-Existence، جیسے خدا Self-Existence ہے۔ پہلی بات تو انسان کے متعلق یہ آ گئی کہ عالم امر میں اس کا وجود نہ تھا، اور دوسری بات یہ کہ عالم خلق میں یہ خود بخود وجود میں نہیں آ گیا ہے۔ اس کی تخلیق خدا نے کی ہے۔

الدھر کا ترجمہ زمانہ کیا جائے گا، ٹائم کیا جائے گا۔ یہ لفظ زمان کے لئے بھی آتا ہے۔ فلسفے میں زمان یا ٹائم کا مسئلہ اتنا مشکل ہے کہ بڑے سے بڑے فلاسفرز بھی تھک ہار کر کہہ جاتے ہیں کہ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جب ہم کہیں گے کہ خدا ابتداء (ازل) سے ہے تو لفظ ابتداء یا ازل کے معنی ہمارے ذہن میں نہیں آئیں گے، کیونکہ انسانی ذہن وقت سے آگے، وقت سے ہٹ کر یعنی Timeless کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا۔ یہ بات کہ ''خدا ازل سے ہے اور

ہمیشہ رہے گا''، انسان کی سمجھ میں نہیں آسکتی، کیونکہ خدا لامحدود ہے اور ہمارا ذہن محدود ہے، اس لئے وہ ہمارے محدود ذہن میں نہیں سما سکتا۔ لہٰذا، اس مسئلے میں الجھ کر اپنا وقت ضائع نہ کریں، آپ کے پلّے کچھ نہیں پڑے گا۔ ویسے بھی فلسفہ کا زندگی کے عملی مسائل سے کچھ تعلق نہیں ہوتا۔

فلسفیوں نے دو قسم کے ٹائم تسلیم کیے ہیں ایک ''بے دورانیہ زمان، طویل المدت عرصہ'' Durationless Time اور دوسرا ''مبنی برسلسلہ زمان'' Serial Time۔ بہرحال آپ اس بحث میں نہ پڑیں۔ قرآن کریم میں وقت کے لئے دو الفاظ ''دھر'' اور ''عصر'' آئے ہیں۔ گویا عربی میں ٹائم کے لئے دو الفاظ ہیں۔ ''ابتداء سے انتہا تک طویل المدّت عرصے'' کو عرب ''دھر'' کہتے تھے اور ابتدا سے انتہا تک طویل المدّت عرصے کے دوران ''تھوڑے عرصے یا وقت کو وہ عصر یا زمان'' کہتے تھے۔ بہرحال قرآن نے یہاں ''دھر'' کہا ہے۔ یہ تو ہمیں معلوم ہے کہ انسان کے متعلق عالم امر یعنی ازل میں پلاننگ سے لے کر اسکو اختیار و ارادہ عطا کرنے کا عرصہ ''الدھر'' ہی میں آیا ہے۔ عالم امر یعنی ازل میں تو اس کا وجود ہی نہ تھا۔ البتہ عالم خلق میں یہ وجود میں تو آ گیا تھا، لیکن انسان کہلانے کے قابل نہیں ہوا تھا، یعنی یہ انسانی وجود میں نہ تھا۔ اسی ازل سے ہمیشہ رہنے والے وقت (ٹائم) ''الدھر'' کے دوران، خدا نے اسے اس قابل بنا دیا کہ یہ ذات یعنی اختیار و ارادے کا مستحق ٹھہرا۔ اب آیت کا مفہوم یہ ہو جائے گا کہ ''دہر کے ٹائم میں کیا انسان پر وہ عرصہ نہیں گزرا، جب یہ انسانی وجود میں ہی نہ پہنچا تھا''۔

قدیم نظریہِ ارتقاء کا قرآن کی روشنی میں جائزہ:

قرآن کے مطالعہ سے ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خدا کے تخلیقی پروگرام سے پہلے ایک مرحلہ عالمِ امر کا بھی متعارف ہوتا ہے۔ جو محسوس بنیادی عناصر کو عدم سے وجود میں لانے کا ہے۔ اس کے لیے قرآن نے بدعَ اور فطَرَ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ یعنی کسی شے کو پہلے پہل وجود میں لانا۔)

قرآن میں اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو کہا کہ وہ

بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ (2:117)

''(مادہ کے بغیر) عدم سے آسمانوں اور زمین کا بنانے والا ہے۔''

کائنات اور اس کی اشیاء بنی بنائی ہوئی شکل میں وجود میں نہیں آتی ہیں۔ ابتدائے کائنات وہ نقطہ ہے، جہاں سائنس نے اپنے ہتھیار رکھ دیئے ہیں۔ یہ نہیں بتا سکی اور نہ بتا سکے گی کہ کائنات کی ابتداء کہاں سے ہوئی؟ اس بارے میں اب سائنسدانوں نے سوچنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ سائنسدانوں کے ہاں ایک قانون ہے کہ جو محدود Finite ہے وہ لامحدود Infinite کا تصور نہیں کر سکتا۔ انسانی ذہن محدود ہے، یہ لامحدود کا تصور نہیں کر سکتا۔ ابتداء لامحدود ہے، لفظ ابتداء کا تصور ہی ذہن میں نہیں آسکتا۔ کائنات کی ابتداء کا تصور یہ ہے کہ کوئی شے موجود نہ ہو اور عدم Nothingness سے موجود Being ہو جائے۔ جب کائنات نے Effect۔Cause کے تحت آگے بڑھنا شروع کیا، اس نقطہ سے انسان تصور کر سکتا ہے۔

انسان کائنات کی ابتداء کا کیا تصور کر سکے گا، یہ تو عدم Nothingness کا بھی تصور نہیں کر سکتا۔ یَبۡدَؤُا یعنی ابتداء یہ نہیں ہے کہ چیز مکمل شکل Accomplished Form کے اندر وجود میں آجاتی ہے۔ خدا ابتدائی نقطۂ تخلیق سے شے کو تکمیل کی منازل طے کراتا رہتا ہے تا آنکہ شے کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

مزید یہ کہ:

فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ (12:101)

''عدم سے آسمانوں اور زمینوں کا پیدا کرنے والا۔''

یعنی وہ (خدا کی) ذات جو عناصر کائنات کو پہلے پہل عدم سے وجود میں لائی۔

واضح رہے کہ نہ تو قرآن کریم کوئی سائنس کی کتاب ہے اور نہ ہی اس وقت ہمارا موضوع مادہ کی سائنٹیفک تشریح ہے۔ ہمیں کہنا صرف یہ ہے کہ مفردات اپنی محسوس شکل میں ہوں یا توانائی کی صورت میں اصل سوال مسئلہ ارتقاء کا یہ ہے کہ یہ وجود میں کیسے آ گئے۔

قرآن کریم نے اسے ''بَدَعَ اور ''فَطَرَ'' سے تعبیر کیا ہے، یعنی یہ کہہ دیا کہ خدا انھیں عالمِ امر سے عدم سے وجود میں لے آیا۔ اس سے آگے بات انسان کے حیطہ ادراک میں آ ہی نہیں سکتی۔ ہمارا ذہن یہ سمجھ ہی نہیں سکتا کہ کوئی شے عدم سے کس طرح وجود میں آسکتی ہے۔ یہ اشیاء موجود ہیں۔ ان کے وجود سے کوئی بھی انکار نہیں کر سکتا۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہ وجود میں کیسے آ گئیں۔ آئن سٹائن جیسا عظیم سائنس دان بھی کہہ سکا تو فقط اتنا کہ:

''طبیعی سائنس نے اب تمام اشیاء کو حرکت میں تبدیل کر دیا ہے..... کائنات، جو ہمیں اشیاء کا مجموعہ نظر آتی ہے۔ ایک ٹھوس شے نہیں، جو فضا میں پڑی ہے۔ یہ شے (Thing) ہے ہی نہیں بلکہ عمل (Action) ہے یا حوادث (Events) کی عادت۔''

اِس کی مزید وضاحت ہمیں قرآن کے حوالہ سے عالم امر اور عالم تخلیق کی اصطلاحات میں ملتی ہیں۔ کائنات کی محسوس شکلوں کے پیچھے جو اصل حقیقت ہے، اسے قرآن نے اللہ کی مشیت یا ارادہ قرار دیتے ہوئے عالمِ امر کے اصطلاحی نام سے متعارف کرایا۔ لہٰذا قرآن سے نظریہ بتدریج ارتقاء ہمیں عالم امر اور عالم خلق کے تصور کو سامنے لا کر واضح کرنا ہوگا۔

خدا کا عالم امر اور عالم خلق کا تصور:

خدا کی معلوم دنیاؤں میں سے، صرف دو دنیاؤں کو ہم جانتے ہیں، جن کا پتہ بھی خود خدا نے ہمیں دیا ہے۔ ان دنیاؤں میں سے ایک کو اس کا عالم امر یا اس کا عالم مشیّت کہتے ہیں، جس کے متعلق نہ خدا نے انسان کو علم دیا ہے، اور نہ انسان کو اس سے متعلق علم حاصل کرنے کی استطاعت عطا کی گئی ہے۔ یہ وہ عالم ہے، جس میں خدا کی اسکیموں کا آغاز ہوتا ہے۔ اس عالم کے متعلق نہ سائنسدان کچھ کہہ سکے ہیں اور نہ کہہ سکیں گے۔ جو کچھ خدا نے بتایا ہے، اس کو سمجھنے کے لئے مثال تو انسانوں ہی کی

دی جائے گی، ورنہ یہ کہنا کہ ''خدا کے ذہن میں تصوّر، ارادہ، یا اسکیم آتی ہے''، تو خدا کے لئے تو ذہن کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بات یاد رہے کہ عالم امر سے متعلق کسی بات کی کیفیّت کی حقیقت کو انسانوں کی کسی زبان میں بھی بیان نہیں کیا جا سکتا۔ بہر حال سمجھنے کے لئے تو بات انسانی زبان میں ہی کی جائے گی، کیونکہ انسانوں کو سمجھانے کے لئے، خدا نے بھی انسانی زبان کے الفاظ ہی استعمال کیے ہیں۔

انسان جب کسی چیز کی تخلیق کرنا چاہتا ہے، تو سب سے پہلے، اس کے ذہن میں اس شے کا تصور آتا ہے، ایک نقشہ آتا ہے، ایک اسکیم آتی ہے۔ وہ شے، وہ اسکیم یا وہ تصور ابھی صرف ذہن ہی میں ہوتا ہے، یعنی وہ فی الواقعہ محسوس شکل میں موجود نہیں ہوتا۔ گویا یہ سارا کچھ انسان کے ذہن یعنی انسان کے عالم امر میں ہوتا ہے۔ شے یا اسکیم کی تکمیل کے لئے، وہ کاغذ پر تمام تفاصیل کے ساتھ نقشہ تیار کرتا ہے۔ مثلاً ایک مکان بنانا ہے، تو سب سے پہلے اس کا نقشہ انسان اپنے ذہن میں بناتا ہے۔ پھر اگر خود کاغذ پر نقشہ بنانا جانتا ہے تو وہ خود بناتا ہے، اور اگر نہیں جانتا تو کسی نقشہ بنانے والے کو اپنا تصور بیان کرتا ہے تو وہ نقشہ بنا دیتا ہے۔ ابھی مکان صرف نقشے پر بنا ہے، زمین پر نہیں بنا۔

جب مکان تعمیر کیا جاتا ہے، تو اس کو پست ترین نقطے یعنی بنیادوں میں پہلی اینٹ رکھنے سے شروع کیا جاتا ہے۔ پہلی اینٹ کا بنیادوں میں رکھنا انسان کے عالم خلق کی ابتداء ہے، یہ اسکیم یا تصوّر کا محسوس شکل میں آنے کا مرحلہ ہے، یہ مکان کی ابتداء ہے، آغاز ہے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ، بتدریج مکان پایہ تکمیل کو پہنچتا ہے۔ مکان کی ابتداء بنیاد کھودنے اور پہلی اینٹ رکھنے سے پہلے کے مراحل کا تعلق انسان کے عالم امر سے ہے۔ انسان کی نگاہ ''کُل'' پر نہیں ہوتی، اس لئے اِس کی اسکیم ناقص بھی رہ جاتی ہے، جس کو تبدیل کرنے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے برعکس خدا کی نگاہ ''کُل'' پر ہوتی ہے، اس لئے اس کو اپنی اسکیم میں کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مکان کی محسوس ابتداء پہلی اینٹ رکھنے سے انسان کا عالم خلق شروع ہوتا ہے۔ خدا کے سامنے اسکیم یا تصور کیسے سامنے آتا ہے؟ اور محسوس ابتداء سے پہلے کیا کیا مراحل طے ہوتے ہیں؟ ان کا علم انسان کو نہیں ہے اور نہ انسان خدا کے عالم امر سے متعلق علم حاصل کر سکتا ہے۔

اس حقیقت کے اظہار کے لیے قرآن کریم کے مختلف مقامات پر اس قسم کی آیات آتی ہیں۔

وَاِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۱۱۷﴾ (2:117)

''اور جب وہ ایک کام کا حکم کرتا ہے تو اُسے کہہ دیتا ہے، ہو، سو وہ ہو جاتا ہے۔''

عالم امر میں ''کُن'' کہنے والی بات بھی خدا نے انسانوں کو سمجھانے کے لئے کہی ہے، ورنہ خدا کو لفظ ''کُن'' کہنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی۔ عالم امر میں وقت درکار نہیں ہوتا۔ اب ''کن'' کہنے میں بھی تو کچھ نہ کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ لہٰذا خدا نے انسانوں کو سمجھانے کے لئے ''کن'' والی بات کہی ہے، کیونکہ انسان کی سمجھ میں وہ بات آ ہی نہیں سکتی، جس میں وقت درکار نہ ہو۔ Durationless کا تصور انسانی ذہن نہیں کر سکتا۔ سمجھنے کے لئے یوں سمجھو کہ کائنات کا، بشمول

انسان، ایک اسکیم، ایک تصور خدا کے سامنے آیا۔ اس اسکیم یا تصور کی نوک پلک درست کی گئی اور پھر عالم خلق میں پست ترین نقطے سے اس کا آغاز کیا۔ عالم امر میں ''اسکیم کا اور تصور کا سامنے آنا''، اس کی ''نوک پلک درست کرنے'' کو ہم سمجھ نہیں سکتے کیونکہ عالم امر Durationless ہے۔ سمجھنے کے لئے عالم امر کو اس طرح سمجھنا چاہیئے، ورنہ حقیقت میں اسکیم یا تصور کیسے سامنے آتا ہے؟ پھر اس کے بعد محسوس تخلیق سے پہلے مراحل کس طرح طے ہوتے ہیں؟ اس کے متعلق ہم نہ جان سکے ہیں، اور نہ جان سکیں گے۔ کوئی چیز عدم سے وجود میں کیسے آتی ہے؟ اس کو انسانی ذہن سمجھ ہی نہیں سکتا۔

خدا کے لئے ماضی، حال اور مستقبل سب ''حال'' ہے، لیکن انسانوں کو اس گوشے کو سمجھانے کے لئے انسانی زبان میں یوں وضاحت کی جائے گی کہ خدا ماضی میں جو پروگرامنگ کرتا رہا ہے، وہ اپنی اُس پروگرامنگ سے پہلے سے آگاہ تھا، اور جو اِس وقت پروگرامنگ کر رہا ہے، خدا اُس سے بھی، پہلے سے آگاہ تھا اور جو آئندہ پروگرامنگ کرے گا، وہ اُس سے بھی آگاہ ہے، کیونکہ خدا کی ''کُل'' پر نگاہ ہے۔ خدا جب اپنے کسی پروگرام کو بروئے کار لانا چاہتا ہے، تو خدا کا یہ ''چاہنا'' یعنی خدا کا ارادہ عالم خلق میں پست ترین نقطہ میں ڈھل کر شے بن جاتا ہے اور پھر شے طبیعی قوانین کے مطابق مختلف ارتقائی مراحل اور ارتقاء کا تکمیلی نقطہ یا تکمیلی درجہ، جو اس شے کے لئے مشیّت خداوندی نے عالم امر میں طے کر دیا تھا، کے مطابق شے تکمیلی مراحل طے کرتی بڑھتی اور اوپر اٹھتی چلی جاتی ہے۔ اِس بتدریج ارتقاء کی تفصیل جو قرآن سے ملتی ہے وہ ذرا آگے بیان کی جائے گی۔

علامہ اقبال نے مشہور مفکر (Pringlr Pattision) کے حوالے سے کہا ہے کہ انگریزی زبان کی کوتاہ دامنی ہے کہ اس میں تخلیق کے لیے صرف ایک لفظ (Creation) ہے حالانکہ ضروری تھا کہ تخلیق کے ان ہر دو (غیر مرئی اور محسوس) مراحل کے لیے الگ الگ الفاظ ہوتے۔ عربی زبان میں امر اور خلق کے یہ الگ الگ الفاظ موجود ہیں اور قرآن کریم نے انھیں اسی مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔

خدا کے عالم امر میں کیا ہو رہا تھا، کیا ہو رہا ہے یا کیا ہوگا، انسان اس سے باخبر نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ یہ خالص علمِ الٰہی اور عملِ الٰہی کا میدان ہے۔ انسان کا علم، عالم خلق میں شے کی تخلیق یعنی شے کے پست ترین نقطہء آغاز سے شروع ہو کر شے کے تکمیلی نقطے پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ چونکہ خدا کی نظر ''کُل'' پر ہے اس لئے اپنے طے شدہ ارادے میں کسی قسم کا ردّ و بدل کرنے کی ضرورت بھی اسے نہیں پڑتی۔

جدید نظریہ ارتقاء:

کوئی تین سو سال پہلے سائنس نے یہ بات بے نقاب (Discover) کی کہ یہ جو بھی خارجی کائنات انسانوں سمیت ہے، یہ پہلے دن سے اِس شکل میں سامنے نہیں آ گئی تھی۔ ہر شے کا آغاز پست ترین درجے میں ہوا۔ ہر شے ہزاروں لاکھوں سال کی منزلیں طے کرتی ہوئی، موجودہ شکل میں پہنچی۔ پہلا نقطہ آغاز کیسے ہوا؟ اِس کے متعلق نہ

سائنس کچھ کہہ سکی ہے، نہ کہہ سکے گی۔ اِس لئے سائنس دانوں نے یہ کہا کہ کسی نہ کسی طرح اتفاق سے یہ وجود میں آ گئی۔ جدید نظریہ ارتقاء پیش کرنے والوں میں سب سے پہلے چارلس ڈارون کا نام آتا ہے، لہٰذا ابتداً اُسی کے نظریہ کے بیان سے ہوتی ہے۔

ڈارون کا نظریہ ارتقاء/نظریہ ارتقاء میں ڈارون کی وضاحت:

ڈارون نے نظریہ ارتقا کا آغاز عالمِ حیوانات سے کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انواع حیوانات نے ایک ارتقائی شکل اختیار کی۔ ہمارے سامنے یہ واضح ہے کہ پودے یا جانور کی تشکیل تک ارتقائی مراحل میں نشوونما کے قوانین فطرت انتخاب اور بقائے اصلح کے تحت دیکھا جا رہا ہے کہ باقی رہنے والا کردار اور باقی رہنے والے معیارات ماحول کے ساتھ نسبتاً بہتر مطابقت کا باعث ہوتے ہیں۔ بہرحال ڈارونی نظریہ نے اچھے کردار اور بقاء میں تعلق قائم کر کے ارتقائی نظریہ سے ہمارے موضوع اخلاقیات کو ایک مخصوص راہ بخش دی ہے۔ بقاء کے متعلق نظریہ ارتقاء جائز طور پر یہ کہہ سکتا ہے کہ کردار کی مختلف قسموں میں سے جہد للبقاء کے نتیجے میں جو قسم پائی جاتی ہے وہ کردار کی دوسری قسموں سے بہتر ہوتی ہے۔ جنگ میں فتح پانے والوں کا تمدن مفتوحین سے ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔ بعض ارتقائین اس نظریہ کے حامی نظر آتے ہیں کہ وہ کردار اچھا ہے جو خود اس کردار کے حامل یا اس کی نسل کی بقاء کا باعث ہو۔

ارتقاء کا وسیع ترین مفہوم یہ ہے کہ ظاہری پیچیدہ شکلوں کا ظاہری سادہ شکلوں سے نشوونما پانا، جیسے بیج کا ارتقا درخت کی شکل میں ہوتا ہے۔ ڈارون اور سپنسر جب لفظ ''ارتقاء'' استعمال کرتے ہیں تو اس میں نشوونما کا مفہوم بھی شامل ہے۔ مگر یہ امر واضح رہنا چاہیے کہ نشوونماء میں نئی اشکال کی پیدائش نہیں ہوتی بلکہ جو کچھ موجود ہوتا ہے اس کا لازمی نتیجہ برآمد ہوتا ہے۔ ڈارون کے نزدیک ''ارتقا'' کے معنی یہ ہیں کہ کل جاندار، انواع نباتات، حیوانات اور انسان سب کے سب دراصل زندگی کی کم ترقی یافتہ شکلوں سے ترقی کر کے عالم وجود میں آتے ہیں اور یہ کہ انواع میں باہمی امتیاز، ان کی انواع کی بقا سے ہوتا ہے جن کے اعضا وقویٰ اس ماحول کے مناسب ہوتے ہیں جن کے اندر یہ پائے گئے ہیں، وہاں ہی ارتقاء واقع ہوتا ہے۔

ڈارون نے اپنا یہ نظریہ مندرجہ ذیل قوانین کی بنیاد رکھتے ہوئے وضع کیا ہے:

1۔ قانون انتخاب طبیعی: اس کا مطلب یہ ہے کہ فطرت وطبیعت موجودات میں سے ان اشیاء کو منتخب کرے جن میں ''بقا'' کی صلاحیت ہو۔

2۔ تنازع للبقاء یہ اس کشمکش اور تنازع کا نام ہے جو افراد یا انواع کے درمیان اپنی بقاء اور حیات کے لیے نظر آتا ہے۔

3۔ بقاء الاصلح: تنازع کی صورت میں کشمکش کے بعد جو شے باقی رہ جائے اس کا موجودات میں اصلح اور بہتر ہونا اور اس طرح اس عالم میں باقی رہنا ''بقاء اصلح'' ہے۔

4۔قانون وراثت: اس کا مطلب یہ ہے کہ جو فطری اور طبیعی صفات آباء واجداد (اصول) میں پائی جاتی ہیں وہی ان کی اولاد (نسل) میں منتقل ہوجاتی ہیں۔

حکمائے جدید میں ڈارون نے اپنا نظریہ ارتقاء (Theory of organic evolution) پیش کیا۔ ڈارون نے کہا کہ زندگی نے اپنی ابتدائی نمود، نہایت پست سطح سے مختلف انواع (Species) کے ذریعہ کی۔ اس کے بعد ان تمام انواع میں ارتقاء کا سلسلہ شروع ہوا۔ یہ ارتقاء خالصتاً میکانکی (طبیعی) قوانین کی رو سے ظہور پذیر ہوا ہے۔ ان قوانین میں طبیعی انتخاب (Natural selection)، ماحول کے ساتھ مطابقت (Adaptability to enviorment)، اور بقاء للاصلح (Survivalof the fittest) نمایاں خصوصیات کے حامل ہیں۔ ہر نوع آہستہ آہستہ بتدریج، ارتقائی مراحل طے کرتی گئی۔ جس نوع میں باقی رہنے کی صلاحیت نہ تھی وہ فنا ہوگئی۔ جس میں یہ صلاحیت تھی وہ خارجی موانع پر قابو پاتی اور اپنے آپ کو ماحول کے مطابق بناتی آگے بڑھتی گئی اور یوں زندگی کے یہ ابتدائی ذرات آہستہ آہستہ آفتاب بنتے گئے۔ اس نظام ارتقاء میں نہ تو کسی خارجی قوت کا کوئی ہاتھ تھا اور نہ ہی زندگی کسی مقصد کے حصول کی اندرونی تڑپ وخلش سے آگے بڑھ رہی تھی۔ محض میکانکی قوانین تھے جن کے ماتحت یہ سب کچھ میکانکی طور پر ہوتا چلا گیا اور بالآخر زندگی انسانی پیکر میں سامنے آگئی۔ اب انسان بھی میکانکی قوانین کے ماتحت جی رہا ہے۔ اور انہی قوانین کے مطابق ختم ہوجائے گا کیونکہ یہ سلسلہ ارتقاء کی آخری کڑی ہے۔ ڈارون کے خیال میں اگر بعض مخلوقات کی فنا وبقا کا سلسلہ یونہی ہزاروں سال سے جاری نہ رہتا تو اس وقت روئے زمین پر تو کوئی مخلوق موجود نہ ہوتی یا پھر ہر مخلوق اتنی تعداد میں ہوتی کہ یہاں انسان قدم نہ رکھ سکتا۔

ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا تنقیدی جائزہ:

ڈارون کے نظریہ ارتقاء کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

1۔حقیقتِ ارتقاء یعنی یہ کہ ارتقاء فی الواقع ہوا ہے اور زندگی کی اعلیٰ حالتیں ادنیٰ حالتوں سے متواتر ہوتی رہتی ہیں۔

2۔سبب ارتقاء: کہ ارتقاء کا سبب قدرت کی اتفاقی اور مقصد کے بغیر کاروائیاں ہیں جنھیں ڈارون کشمکشِ حیات، قدرتی انتخاب اور بقائے اصلح کا نام دیتا ہے۔

ہمارے تنقیدی تجزیہ میں ڈارون کے نظریہ ارتقاء کے یہ دونوں حصے ایک دوسرے کے ساتھ لازم وملزوم جُڑے ہوئے نہیں۔ اگر پہلا حصہ درست ہو تو ضروری نہیں کہ دوسرا حصہ بھی درست ہو۔ لہذا بہتر یہی ہوگا کہ اِن دونوں امور کو الگ الگ مُبحثِ موضوع بنایا جائے۔

(جاری ہے)

مطبوعات طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

بانیٔ پاکستان قائداعظم محمد علی جناحؒ کے تحریکِ پاکستان کی دینی اساس سے متعلق
ذاتی مشیر، منفرد مفکرِ قرآن و بانی تحریک طلوعِ اسلام اور تحریکِ پاکستان گولڈ میڈلسٹ

علامہ غلام احمد پرویز کی تصنیفات 2017

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
مفہوم القرآن (مکمل سیٹ مجلّد)		2500
لغات القرآن (مکمل سیٹ مجلّد)	Out Of Print	
تبویب القرآن (مجلّد)		2000
مطالب الفرقان (مکمل سیٹ ـــــ سورہ فاتحہ تا سورہ الحجر)	2100	4200
مطالب الفرقان (جلد اول)	300	600
مطالب الفرقان (جلد دوم)	300	600
مطالب الفرقان (جلد سوم)	300	600
مطالب الفرقان (جلد چہارم)	300	600
مطالب الفرقان (جلد پنجم)	300	600
مطالب الفرقان (جلد ششم)	300	600
مطالب الفرقان (جلد ہفتم)	300	600
من و یزداں (اللہ کا صحیح تصور)	300	600
اِبلیس و آدم	300	600
جُوئے نور	300	600
برقِ طور (داستانِ حضرت موسیٰؑ)	300	600
شعلۂ مستور (حضرت عیسیٰؑ کی داستان)	300	600
معراجِ انسانیت (سیرتِ رسولِ اکرم ﷺ)	300	600

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
مذاہبِ عالم کی آسمانی کتابیں	250	500
انسان نے کیا سوچا؟	300	600
اِسلام کیا ہے؟	250	500
کتاب التقدیر	300	600
جہانِ فردا (مرنے کے بعد کیا ہوگا؟)	300	600
شاہکارِ رسالت (سیرتِ فاروقِ اعظمؓ)	350	700
نظامِ ربوبیت (قرآن کا معاشی نظام)	300	600
تصوف کی حقیقت	300	600
قرآنی قوانین	200	400
سلیم کے نام خطوط (جلد اول)	250	500
سلیم کے نام خطوط (جلد دوم)	250	500
سلیم کے نام خطوط (جلد سوم)	250	500
طاہرہ کے نام خطوط	250	500
ختمِ نبوت اور تحریکِ "احمدیت"	150	300
حسنِ کردار کا نقشِ تابندہ (قائدِ اعظمؒ)	*	150
اقبالؒ اور قرآن (اول۔دوم)	300	600
مجلسِ اقبالؒ۔اول (شرح مثنوی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی)	300	600
مجلسِ اقبالؒ۔دوم (شرح مثنوی پس چہ باید کرد...)	*	200
قائدِ اعظمؒ کے تصور کا پاکستان (مجموعۂ مقالات و خطبات)	250	500
بہارِ نو (مجموعۂ مقالات و خطبات)	250	500

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
ISLAM: A Challenge to Religion	300	600
Exposition of the Holy Quran	*	2500
The Book Of Destiny	300	600
Reasons for Decline of Muslims	*	300
Islamic Way of Living	150	300
Letters to Tahira	*	500
Quranic Laws	*	600
The Quranic System of Sustenance	*	600
Did Quaid-e-Azam Want to Make Pakistan a Secular State?	*	200
اسلامی معاشرت (روزمرہ کے متعلق قرآنی احکام وہدایات)	150	300
اسبابِ زوالِ امت	100	200
جہاد (جہاد کے متعلق قرآنِ کریم کے احکامات)	*	150
خدا اور سرمایہ دار (مجموعہ مقالات وخطبات)	*	500
سلسبیل (مجموعہ مقالات وخطبات)	250	500
فردوسِ گم گشتہ (مجموعہ مقالات وخطبات)	250	500

متفرق کتب

نام کتاب	پیپر بیک	مجلّد
مقامِ حدیث	200	400
قرآنی فیصلے (جلد اول)	300	600
قرآنی فیصلے (جلد دوم)	300	600
قتلِ مرتد، غلام اور لونڈیاں اور یتیم پوتے کی وراثت	*	150
مزاج شناسِ رسول	150	300
تحریکِ پاکستان کے گم گشتہ حقائق	300	*
The Best Of A.S.K. Joommal	*	600
The Pakistan Idea	*	250
Woman - Recreated	*	250
The Bible - Word of God or Word of Man	*	300
The Holy Quran and our Daily Life	*	300

کتابیں ملنے کا پتہ

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)
25-بی، گلبرگ 2، لاہور
فون نمبر: 35753666
trust@toluislam.com
www.toluislam.com

کرنٹ اکاؤنٹ نمبر 01720041073503، حبیب بینک لمیٹڈ، مین مارکیٹ گلبرگ برانچ، لاہور۔

ان قیمتوں میں ڈاک خرچ اور پیکنگ کا خرچہ شامل نہیں۔ یہ قیمتیں کسی بھی وقت تبدیل ہوسکتی ہیں۔

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل)**

Chapter 6: Tears of passion (*Shola-e-Namnaak* شعلہ نمناک) –

To my fellow travelers

(Tulu-e-Islam Convention, April, 1962)

Episode No: 3

My dear friends, whatever I had to say I have said it. Once again I want to congratulate you for participating in this simple but beautiful gathering, and I pray that may Allah strengthen your intention; that He may instill sincerity in your hearts; that He may increase your determination to face opposition with steadfastness. And let the cosmic forces help you in achieving the enlightened and beautiful goal of life that you have chosen for your mission; and may you keep advancing on this Quranic journey by overcoming every barrier that comes your way!

What a good wish is this O Allah? Please listen!

You came here with great enthusiasm:

To light a lamp of desire in every passionate soul;
To make everyone in the Ummah a witness whole!

And when you depart from here then do so with such strong determination that:

It is because of our common passion that our mission's strong base is safe;
We will do everything possible to protect, to glorify, and to beautify this base!

Finally, let us prayer to Allah from the bottom of our hearts:

رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۪ وَاغْفِرْ لَنَا ۪ وَارْحَمْنَا ۪ اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۧ (2:286)

"O Allah! Do not call us to account if we have forgotten what we ought to do or have fallen into error. May we not be buried under the weight of man-made Laws as were our predecessors? Give us the strength to bear the responsibilities vested in us. If we falter, give us the ability to undo the harm caused by means of good actions. This is how we will be able to secure protection as well as means of development. O Allah! You are our Protector. Grant us success against the K'afireen who oppose Your System."

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ (3:8)

"O Allah! Having found the right path, may our hearts not swerve from it? Grant us means of development. You alone bestow. We know that at this time there are differences amongst humankind but are sure that one day all humanity will become united by following Your immutable Laws. Surely Allah never fails to fulfil His Promise. Nothing shall avail those who reject Your Laws, neither their wealth nor their offspring. Their end will be disastrous."

رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِيْنَ ۧ (7:126)

"O Our Sustainer, give us patience and consistency in such abundance that

until our last breath we remain obedient to Your laws."

رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِينَ سَبَقُونَا بِالْإِيمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِي قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِينَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ (59:10)

"O our Sustainer! Grant us means of protection; and also to our brethren who preceded us in professing Iman. Do not ever put any grudge in our hearts for those who profess Iman. You are compassionate and provider of means of nourishment."

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (2:127)

O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts.

The End...



Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل)**

Chapter 7: Present Hell (*Qiyamat-e- Maujood* قیامت موجود) – To Quran lovers

(Tulu-e-Islam Convention, April, 1963)

By G. A. Parwez

Episode No: 1

O beloved! Bring the goblet; gone are the happy times;
O musician! Sing a song; gone are the chatting times;
O friend! Even though the heart is particularly gloomy;
Tell me the story of the night when we had good times!

Dear Passionate Companions, Salam-o-Rahmat:

How fortunate is this moment and how worthy of high appreciation is this occasion in life that after one year you have enthusiastically gathered together here again so that we, by getting away from all the trials and tribulations and worries of physical life, could think how to uncover the shining light of the Almighty's Book which had been covered by the custodians of religion for centuries in dark layers of their sacred sleeves? How beautiful are your desires that have brought you here after long journeys; and how lovely is the purpose for which you have borne so much hardships of travel? When I look at your simple and graceful gathering filled with passion and ecstasy, my euphoric heart starts echoing:

Fully filled with bright light, is my house;
Which moon has descended in my house?

My dear friends, now that we have carved out few quiet moments from the caravan of time let us devote these moments to refresh our commitment to our cause.

Let us talk of love and trust; then about some cute sweetheart
The heart is fed up with time; let's talk about that sweat friend

Let us recall that lovely passage;
Let us talk about our virtuous fate!

How beautiful are the moments my friends that are spent in talking about love, affection, passion, and trust?

Allama Iqbal has said:

From the start of time until the present, the battleground has always remained;
Amid the evil fire of Abu Lahab and the shining light of Muhammad (PBUH)!

Eternal struggle

The question is: what *that* shining light of the Prophet (PBUH) is that is always at battle with the fire of Abu Lahab? What is the struggle that has perpetually engulfed humanity since the beginning of time? Many powers rose to their pinnacle on the world stage and then disappeared into the dustbin of history. Many ruling regimes have risen and gone down throughout human history. Many civilizations appeared and disappeared and only their ruins are left as lessons of history. But which are those perpetual evil forces of fire that have always remained immune to this change despite the passage of time, and which have always opposed and fought the light of truth throughout human history nonstop – and that fight still continues until today. No matter how deeply you ponder and study history the only conclusion that you will arrive at is this: that the eternal struggle that has been going on nonstop ever since humans opened their eyes till today is the struggle between دین (*Deen*) and religion.

This battle has been going on ever since humans opened their eyes of consciousness. And it is still going on. There is no doubt that capitalism and human rule over human in any form whether of one human (dictatorship or kingship or autocracy) or multiple humans (democracy or oligarchy or aristocracy) – are also no less enemies of humanity. But if you look closely you will find that these systems remain alive only with the support of religion. It is a fact that whenever in history دین (*Deen*) demolished religion then capitalism and secularism automatically disappeared along with it. So, the real battle is only between دین (*Deen*) and religion.

Tyrannies of religion

The concept of religion is the invention of human mind. It is the invention of those who wanted to enjoy life at the expense of others by using a subtle means to defraud people. Religion is such a deceptive but effective method that these custodians of religion defraud people, and people thank them for it; they drive people away, and people cling to their feet; they hurl abuse at people for no

reason, and people beg forgiveness from them; they insult people in public, and people don't let any negative thoughts come against them in their hearts even in the solicitude of their homes; they use people in their service as if is their right, and people consider serving them as a sacrosanct duty. So much so that at their slightest behest people sacrifice theirs as well as their children's life for them; people jump from mountain tops; people willingly present themselves to be guillotined, or throw themselves under the wheels of their chariots. These custodians of religion incite people to flight their opponents and people fight and sacrifice their life without asking what this fight is for. People feed the servants and dogs of these religious custodians while their own children remain hungry. People themselves remain naked but clothe their stones with silk. People themselves live in smudged huts but build marble palaces over their decayed bones and ashes. Leave aside the case when these custodians of religion are alive, people shake with their fear even after they are dead. So much so that these custodians of religion penetrate people's psychology and hover over their minds and hearts like ghosts and people cannot get out from their psychological iron grip.

The grip of religion

These are some of the dominative aspects of religion which the self-serving deceptive diminutive minds crafted and which they used as an effective tool to suck the blood of the weak and the helpless. There is no doubt that capitalists and rulers do suck the blood of people and break the bones of the weak and the helpless. But to keep their grip on the people they need to create and support many institutions of power and use hundreds of political tricks, and still they are constantly worried sick about public anger, public opposition, and even worried about people revolting against them and overthrowing them from power. But the intrigue of religionists is such that their preys come into their nets willingly to be enslaved. And if anyone tries to free them, then these slaves try to choke and kill him.

Keep people ignorant

Religion has used only one simple trick for all its magical charms and intrigues: it attributed whatever it wanted to do to God. This is the secret of their powerful grip over the masses. The way religion achieved this goal was to keep people away from knowledge and understanding; to not let them come even close to using their power of intellect and thought. Religion teaches that the more ignorance one spouts, the closer to God one is. And the more one shows desire in supra-intellect belief, the stronger his belief. The mind-control technique of the custodians of religion is: to not let followers get out of the pit of ignorance; to state to their followers that Iman is to be acquired without

knowledge and reason; to proclaim that their followers must believe in superstitions as the core principle of religion; to make sure that their followers accept everything that is miraculous as truth; and to make sure their followers follow orders blindly without questioning their purpose. There is only one proof provided by the custodians of religion for all this: that *this* is the tradition of our ancestors; that *this* was their faith and ideology – so we *must* follow in their footsteps. If one challenges this ancestor-based ideology then uproar is created against him among the masses by branding him a traitor. People are told that look! He is challenging our ancestors; that he is insulting them? This incites people against him. And history is witness to the fact that the mayhem and destruction and the bloodshed that have been caused by Genghis and Hulagu is miniscule compared to those cause by religion throughout human history. This is the weapon that the custodians of religion use to keep their opponents terrified and silenced. Their entire superstructure of religion stands on people's emotions which they keep charged up by sermons and rituals.

This, my dear friends, is a brief introduction to religion which has had its chokehold on humanity ever since humans opened their eyes.

Allah's دین (*Deen*)

And it is this chokehold that the دین (*Deen*) of Allah kept coming to dislodge, and release humanity from its bondage. The messengers of this دین (*Deen*) were Allah's Prophets who used to bring the message of freedom to humanity shackled under religion. They used to invite people to break this shackle but the custodians of religion stood up in opposition and grouped all their might to fight each Prophet. Rulers and capitalists supported the custodians of religion because in this fight between religion and دین (*Deen*) because both saw their own demise. Therefore, they wanted to strengthen religion and subdue the دین (*Deen*). This is the struggle between religion and دین (*Deen*) that has been going on continuously ever since the beginning of history – in every period and in every place. This is what Allama Iqbal has termed as struggle between the evil fire of Abu Lahab and the shining light of Muhammad (PBUH) and he considers these three evil forces – of religion, capitalism, and *mulukiyah* – as the worst enemies of humanity.

Struggle between religion and دین (*Deen*)

The Quran highlights this struggle again and again by bringing out its different facets. It starts by describing this struggle with the revolutionary call of Noah (PBUH) to his people: وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ ۝ فَقَالَ الْمَلَؤُا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا هٰذَاۤ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ ۙ يُرِيْدُ اَنْ يَّتَفَضَّلَ عَلَيْكُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً ۚ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْۤ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا رَجُلٌۢ بِهٖ جِنَّةٌ فَتَرَبَّصُوْا بِهٖ حَتّٰى حِيْنٍ ۝ (23:23-25) – The first one in this chain was Noah, whom We sent to his own people. He asked them, "O my people, you should only obey the

Divine Laws. No one besides Him is worthy of obedience. Tell me if you are willing and ready to observe His Laws." The tribal chiefs and their surrogates, the landlords and religious chiefs of his community, who were enjoying the bounties of life, refused to accept his message. They told their people, "This man (who is calling himself a messenger of Allah) is a human being like you. He simply wants to attain superiority over you. If Allah wanted to convey a message unto us, He would have surely sent angels. Why should He send an ordinary man like us? Moreover whatever he says is very strange which we have never heard such a thing from our forefathers." They continued: "It appears as if he has lost his mind. So do not pay any heed to what this madman is saying. Just wait for a few days and see what his end will be."

After this the Quran has described that a series of Allah's messengers came to different communities with the same message: that no human or group of humans has right to rule over other human beings and make them obey to man-made laws; that obedience is due only to the laws of Allah given in a book (comprising of Allah's revelation) through every messenger. But the rulers and religious chiefs always ganged up in opposition against it at every time and every place. They had only one slogan to inflame the emotions of people: وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّا رَجُلٌ يُّرِيْدُ اَنْ يَّصُدَّكُمْ عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُكُمْ ۚ وَقَالُوْا مَا هٰذَآ اِلَّآ اِفْكٌ مُّفْتَرًى ۭ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَاۗءَهُمْ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ (34:43) – The condition of these people is such that when Our clear Laws (message) are presented to them, they incite people by saying that this person wants to turn you away from the path which your ancestors used to follow. All this is a falsity which he has fabricated and attributed to Allah. When the truth is presented to these people, they say that it is nothing but pure and open falsehood.

Therefore: قَالُوْا حَرِّقُوْهُ وَانْصُرُوْٓا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ (21:68) – They instigated the masses and said: "If you have any courage you should get up and burn this person alive and thereby openly uphold your gods!"

Revolutionary voice of Jesus (PBUH)

This opposition had reached its high point during the time of Jesus and was led by the religious priesthood. Priests at the time of Jesus had everything worked out with the Roman governor. They had established their own parallel government. Only for the death penalty they had to get the approval of Roman authorities. Roman secular government didn't interfere in their religious affairs and didn't care how they practiced their religion. But with the arrival of Jesus and with his revolutionary sermons the priests became very worried. Jesus would stand at the steps of the temple in Jerusalem which was the center of priesthood and declare:

"Woe to you, teachers of the law and Pharisees, you hypocrites! You

shut the door of the kingdom of heaven in people's faces. You yourselves do not enter, nor will you let those enter who are trying to.

"Woe to you, teachers of the law and Pharisees, you hypocrites! You travel over land and sea to win a single convert, and when you have succeeded, you make them twice as much a child of hell as you are.

"Woe to you, teachers of the law and Pharisees, you hypocrites! You are like whitewashed tombs, which look beautiful on the outside but on the inside are full of the bones of the dead and everything unclean. In the same way, on the outside you appear to people as righteous but on the inside you are full of hypocrisy and wickedness.

"You snakes! You brood of vipers! How will you escape being condemned to hell?"[Matthew 23]

Why the opposition?

Why did the religious priesthood put up such a strong opposition to all the prophets without exception? How could the religious priests tolerate these extremely revolutionary sermons of Jesus when they were looting and ruling the people in God's name? What did they think of this message of Jesus? One cannot find the answer to this in the popular four books of the Bible. But there is another Bible called the Bible of Barnabas. It is written in the Bible of Barnabas that the priests were very worried with Jesus's pronouncements. They went to their head-priest and said to him that if this person were to become the king then what we will do? It is clear from this that they were worried about their livelihood if Jesus came to power because Jesus was not some kind of monastic spiritual otherworldly person as he is portrayed out to be. In fact, he was a revolutionary figure who wanted to establish the rule of God on earth. From this it is clear that the priests were worried that their freeloading will be over if this person came to power; that they would no longer remain parasites of the society but they would have to earn their livelihood by working hard just like other people; or they would have to beg in the streets by becoming beggars. They told their people that, now, if we do any wrong then we are able to please our merciful God by prayers and sacrifice. But if this person were to become the king then we would never be able to please him because he will enforce the sharia of Moses.

Did you notice, my friends, why there is so much opposition of the heavenly revolutionary message from the priests. Just the same one reason: if the Allah's law is established then all their power and status will be gone. And since priests cannot do any real work they will have to beg for their bread. Did you see what is presented as a religious question turns out be in fact purely an economic issue?

To be continued.....

4- وہ دائرہ اسلام سے باہر چوٹی کے حکماء اور فُضلاء کو ذہن میں رکھیں کیونکہ یہی لوگ ہیں جن کے قائل ہونے سے دنیا کی ذہنی فضا سے باطل تصورات کا اثر زائل کیا جا سکتا ہے۔

5- وہ علمی دنیا کے مسلمہ حقائق سے آغاز کر کے ان قرآنی حقائق کی طرف آئیں جن کی صحت لوگوں کے نزدیک مسلم نہیں۔

6- کسی غلط عقیدہ کی محض نفی مخالفین کو قائل نہیں کر سکتی جب تک اس کے مقابل کے صحیح تصور کا اثبات نہ کیا جائے۔

7- وہ ایک فلسفہ یا ایک فلسفیانہ خیال کی تردید کے لئے جن تصورات کو صحیح سمجھ کر کام میں لائیں تو کسی دوسرے فلسفہ یا فلسفیانہ خیال کی تردید کرتے ہوئے اسے غلط قرار نہ دیں۔ بلکہ اپنے موقف پر قائم رہیں۔

8- مغرب کے صحیح تصورات کو نہ تو رد کریں اور نہ ہی ان کے غلط تصورات کو قبول کریں۔

9- ہر غلط فلسفہ کے اندر وہ جن تصورات کو صحیح سمجھیں انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے غلط قرار نہ دیں اور جن تصورات کو غلط سمجھیں، انہیں دوسرے فلسفوں کی تردید کرتے ہوئے صحیح قرار نہ دیں ورنہ وہ اپنی تردید خود کریں گے۔

(3) ڈاکٹر برہان احمد فاروقی کا موقف:

1- کسی علمی صداقت کے ساتھ متصادم نہ ہو بلکہ ہر زمانہ میں تمام علمی صداقتوں کے ساتھ پوری طرح سے ہم نوا اور ہم آہنگ رہے اور جوں جوں علمی صداقتیں منکشف ہوں وہ اس کے اندر سماتی چلی جائیں۔

2- جس کے تمام تصورات ایک دوسرے کے ساتھ عقلی ربط وضبط رکھتے ہوں اور ایک دوسرے کی عقلی تائید اور توثیق کرتے ہوں۔ یہ اسی صورت میں ممکن ہو سکتا ہے جب اس کے تمام تصورات قرآن کے بنیادی تصور کے ساتھ عقلی طور پر متعلق ہوں۔

3- جو تمام باطل فلسفوں کی موثر تردید کرتی ہو۔

4- جو کائنات کا ایک مکمل فلسفہ ہو اور حقیقتِ انسان و کائنات کے اہم مسائل کے بارے میں عملی راہ نمائی کرتی اور صداقت اور سچائی کا راستہ بتاتی ہو۔

5- جو علمی تصورات کی خامیوں کو آشکار کر کے انہیں پاکیزہ اور شُستہ بناتی ہو۔

6- جو ہمیں احکامِ دین کی حکمتوں اور علتوں کے پورے سلسلہ سے آگاہ کرتی ہو اور ان حکمتوں اور علتوں کا ایک ایسا تصور دیتی ہو، جس میں اندرونی طور پر کوئی تضاد نہ ہو۔



(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)



PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 70
ISSUE
9

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

6 ستمبر یومِ دفاعِ پاکستان

